

لکیریں اور تقدیریں

سندس جبین

PDFBOOKSFREE.PK



لکیریں اور تقدیریں

سُندس جبین

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون: 37352332-37232336

لکیریں اور تقدیریں

خواب گاہ کی پر اسرار اور وحشت ناک خاموشی میں دو نفوس بالکل ساکت تھیں وہ اتنے فاصلے پر تھے گویا دریا کے دو کنارے..... جو ہمیشہ سے الگ چلے آ رہے ہیں مگر کبھی مل نہ پائے ہوں۔ مرد کی ہموار اور متوازن چلنے والی سانسیں بتاتی تھیں کہ وہ گہری نیند میں تھا جب کہ عورت جاگ رہی تھی۔ بیڈ پر چت لیٹے ہوئے اس کی آنکھیں چھت پر ساکت تھیں۔

کیا کچھ نہ تھا ان آنکھوں میں..... وحشت..... اذیت..... حیرت اور آنے والے دنوں کا خوف.....

اس کی سانسوں کا زیر و بم اتنا دھیمہ تھا کہ بادی النظر میں یہی لگتا تھا کہ وہ کوئی زندہ لاش ہے جو زرد چہرے اور کھلی آنکھوں کے ساتھ وحشت ناک موت کی سرحد عبور کر گئی ہے۔ یکانخت کھلی کھڑکی سے سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ مرد نے کسمسا کر کروٹ بدلی اور خود میں سمٹ گیا جب کہ عورت کے انداز میں کوئی تبدیل نہیں آئی تھی۔



وہ دو کمروں کا مکان تھا جس کے صحن میں ساٹھ واٹ کا بلب روشن تھا صحن میں

تین چار پائیاں کچھی تھیں جن میں سے ایک پر اماں دوسری پر ابا جب کہ تیسری چار پائی خالی تھی۔ کمرے کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی لڑکی کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس کی عمر بمشکل سترہ اٹھارہ سال ہوگی۔ بلب کی زرد روشنی میں اس کا سانولا رنگ بھی زردی میں گھلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ بہت حسین و جمیل تو نہیں تھی مگر اس کے نقوش میں بلا کی جاذبیت تھی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی دلکشی میں بڑی بڑی چمک دار سیاہ آنکھوں کا دخل زیادہ تھا یا بھرے بھرے عنابی ہونٹوں کا..... اس کی تیکھی ناک میں سونے کی باریک سی تاری تھی جو اس پر بہت سج رہی تھی۔

اس کی چمک دار آنکھیں کتاب کے اوراق پر ساکت تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور کلائی پر بندھی ہوئی سستی سی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ ایک تہائی رات گزر چکی تھی۔ اس نے کتاب بند کر کے ساتھ پڑی تپائی پر دھری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ زینوں کی جانب بڑھنے لگے۔ بے آواز زینے چڑھتی ہوئی وہ چھت پر آگئی۔ بلب کی روشنی بڑی کم مقدار میں چھت پر پہنچ رہی تھی اور چھت نیم تاریکی میں ڈوبی نظر آرہی تھی۔

اس کے قدم چھت کے آخری سرے پر جا کر رک گئے۔ وہ ایک وسیع و عریض مکان کا بغلی حصہ تھا جس کی دیوار اس سرے کے ساتھ منسلک تھی وہ دیوار کسی کمرے کا حصہ معلوم ہوتی تھی اس بات کا ثبوت لکڑی کے چوڑے پنوں والی کھڑکی دے رہی تھی جو فی الوقت بند تھی اور اس کے آگے گرے دیوار پر دے اندر کا منظر دیکھنے میں مزاحم تھے۔ وہ خاموشی سے دیوار کے ساتھ ٹک گئی۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھل گئی اور ایک انیس بیس سالہ نوجوان کوڈ کر باہر آگیا۔ اس کے دانیں ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ اس نے جھک کر ٹرے زمین پر رکھی اور اس کی طرف مڑا جو کمال بے نیازی سے پاؤں کے انگوٹھے سے چھت کی مٹی کرید رہی تھی۔

”موہنی کریم الدین! یہ بے نیازی یہ بے رخی کب تک.....؟ اس کے لہجے میں تڑپ تھی۔ ”موہنی.....“ اس نے پھر پکارا ”میں تم سے مخاطب ہوں خدا را مجھے

خاموشی کی مارمت مارو مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“ اس کے لہجے میں سچائی کی تڑپ اور بے چینی تھی پہلے ہی وہ اتنی مشکلوں سے آمادہ ہوئی تھی چھت پر آنے کے لیے مستزاد سخت ناراض تھی۔ اب اس کی خاموشی اور بے رخی موہنی کی آنکھیں خلاؤں میں جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ وہ خاموش ہو گیا۔ بس اس کے جاذب چہرے اور دلکش نقوش کو دیکھتا رہا۔ وفود شوق سے آنکھیں بھی مسکر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے طویل سانس لے کر چہرہ اس کی طرف موڑا۔

”تم نے کیا سوچا ہے شاہ.....؟“ اس کا ٹھنڈا لہجہ جذبات سے یکسر عاری تھا۔ وہ گڑ بڑا گیا۔ انہماک چھناک سے ٹوٹا۔ تصوراتی دنیا سے حقیقی دنیا میں آنے میں صرف ایک پل لگا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے تو ابھی کم عمر ہے اور میری اماں کو لگتا ہے کہ میری عمر بڑھتی جا رہی ہے“

”موہنی میں.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔

”تم کچھ نہیں کر سکتے شاہ! کتنی رکاوٹیں حائل ہیں تمہارے اور میرے بیچ..... گنوا نے بیٹھوں تو رات بیت جائے۔ تم اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہوئے۔ تمہیں ابھی پڑھنا ہے ابھی تمہاری عمر ہی کیا۔ تم تو عالی نسب ہو شاہ..... کیوں ہم جیسے کبھی واسیوں سے دل لگا لیا؟“ اس کے لہجے میں جگر کاٹ دینے والی تلخی تھی۔

”میری بات سنو میں.....“ اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ موہنی نے اس کی بات کاٹی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے یہ جو آئے روز اماں کے بلاوے پر نت نئی عورتیں چلی آتی ہیں مجھے دیکھنے، مجھے بڑا اچھا لگتا ہے.....؟ اس نے ایک اور وار کیا۔

”میں سمجھتا ہوں لیکن.....؟“ وہ دانستہ رک گیا۔

”لیکن.....؟“ وہ دھیرے سے ہنسی ”جب مرد لیکن پر آ کر رکھ جائے تو سمجھو

”تم ناراض ہو مجھ سے؟“ وہ پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ ”خدا کے لیے چلے جاؤ۔ نہیں ہوں ناراض“ بلب کی روشنی میں اس کے عنابی لب تھر تھرا رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ موہنی کا ہاتھ تھاما اور اسے سیرھیں سے کھینچتا ہوا چھت پر لے آیا۔

”چھوڑو مجھے۔ میں نے کہا چھوڑو مجھے“ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا ”بس یہی کر سکتے ہو میرے لیے؟“ وہ طنز سے بولی۔ وہ بے ساختہ ہنسا۔

”نہیں اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں“

”مثلاً.....؟“ وہ اس کی مسکراہٹ سے چڑی۔

”جان دے سکتا ہوں اور بولو کیا چاہیے؟ شاہ نواز کے لہجے میں دنیا جہان کی محبت سمٹ آئی تھی۔

”جان نہیں چاہیے..... مجھے تو تمہاری زندگی تمہاری لمبی عمر چاہیے“ وہ یاسیت سے بولی۔

”تم کیوں اتنی مایوس ہو رہی ہو؟ میں صبح اسلام آباد جا رہا ہوں۔ دو ہفتوں کے لیے۔ واپس آ کر سب سے پہلے ماما سے بات کروں گا اور پریشانی کی کیا بات ہے..... انہیں بہر حال میری بات ماننی پڑے گی“ وہ بڑے سکون سے بولا۔

”کیوں ماننی پڑے گی؟“

”کیوں کہ انہیں پتا ہے کہ میں کتنا ضدی ہوں“ وہ تقاخر سے بولا۔

”تم سچ کہہ رہے ہو شاہ؟“ موہنی کی جگر جگر کرتی آنکھوں میں سنہرے خواب اتر آئے۔ چہرہ شفق کی طرح ڈھل گیا۔ وہ مبہوت سایہ منظر دیکھتا رہا۔

”بالکل سچ.....“ وہ ٹرانس کی کیفیت میں مسکرایا۔

”کھانے میں کیا ہے؟“ موہنی نے ٹرے اپنی سمیت کھینچی۔

”اب تو سب ٹھنڈا ہو گیا۔“ وہ افسوس سے بولا۔

”چلو آج ٹھنڈا ہی سہی“ وہ ہنستے ہوئے نوالہ بنانے لگی۔

کھیل ختم.....“ وہ ہاتھ جھاڑ کے کچی چھت سے اٹھی۔

”اگر میں مجبور ہو جاؤں یا کردی جاؤں تو بے وفائی کا الزام مت دے دینا“

کیا کچھ نہ تھا اس کے لہجے میں..... آنسو، آہیں، سسکیاں، فریادیں، جانے کیا کچھ.....؟

وہ تیزی سے سڑھیوں کی جانب لپکی۔

”موہنی!“ اس نے دہی آواز سے پکارا۔ وہ تیزی سے سڑھیاں اتر گئی۔ مبادا اس کی آواز قدموں میں بیڑیاں ڈال دے۔

وہ گم صم بیٹھا تھا۔ سر مڑگاں چمکتے موتیوں نے اسے احساس دلایا کہ موہنی کی باتوں نے اسے کس قدر تکلیف سے دوچار کیا ہے کھانے کی ٹرے جوں کی توں دھری تھی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا وہ جب ملتے دونوں میں سے کوئی ایک کھانا لے آتا اور یوں کھانے کے دوران ڈھیروں باتیں کرتے مگر آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ چند لمحے اسی طرح بیٹھا رہا۔

وہ شاہ زادی تھی۔ اس کے دل کی ملکہ..... جب چلتی تو گویا ہوا میں تیرتی محسوس ہوتی اور جب بات کرتی تو اس کا ہر لفظ گیت بن کر اس کے کانوں میں رس گھولتا..... وہ اس کے پیچھے دو سالوں سے پاگل تھا۔ وہ اس کی ناراضگی برداشت کر ہی نہ سکتا تھا۔ اس وقت بھی اسے لگا تھا گویا اس کا دل مسلا گیا ہو۔ وہ بے ساختہ اٹھا اور چھت کے کنارے پر آ کر نیچے جھانکا۔ چار پائی پر گراموہنی کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ لازمی بات تھی کہ وہ رو رہی تھی۔ نیچے جانا یقیناً بہت بڑا رسک تھا مگر فی الوقت اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ جنون نے اس کی خرد کو کھالیا تھا۔ وہ تیزی سے سڑھیوں کی جانب لپکا۔

”موہنی!“ اس کے قریب چار پائی کے پاس گھنٹوں کے بل بیٹھے ہوئے وہ دھیمی آواز میں بولا۔ موہنی کو جیسے کرنٹ لگا۔ وہ جھٹکا کھا کر سیدھی ہوئی۔

”تم پاگل ہو گئے ہو شاہ! کیوں آئے ہو یہاں؟

جاؤ یہاں سے.....“ وہ اسے دھکیل کر بولی۔ رنگ زرد پڑ گیا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

نام تو اس کا مونی تھا مگر سوائے شاہ نواز کے آج تک اسے اس نام سے کسی نہیں پکارا تھا۔ باقی سب کے لئے وہ ”مونہ“ تھی اس کا تعلق ملک کے اس طبقے سے تھا جو خط غربت سے بھی کم تر درجے کی زندگی گزارتے ہیں مگر اس کی خوش قسمتی کہ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی جس کی وجہ سے اس نے شاہ زادوں جیسی زندگی گزاری تھی۔ اماں ابانے اس کی ہر خواہش پوری کی..... جیسا چاہا کھایا، جیسا چاہا پہنا..... دل چاہتا تو کام کر لیتی ورنہ صفا چٹ انکار..... کبھی کبھی اکیلا پن اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تو اماں کے سر ہو جاتی۔

”کیا تھا اگر میرے بھی دو چار بہن بھائی ہوتے“ وہ ہنس کر اسے تسلی دیتیں۔
 ”جو خدا کی مرضی“

گورنمنٹ سکول سے میٹرک کرنے کے بعد اب وہ پرائیویٹ انٹر کی تیاری کر رہی تھی۔ اماں تو قطعی طور پر اس کے آگے پڑھنے کے حق میں نہ تھیں۔ ان کی برادری میں لڑکیاں صرف پرائمری کرتی تھیں بڑا تیر مارا تو ڈل کر لیا مگر وہ بھی ”مونہ“ تھی اپنے نام کی ایک۔ اماں کو ساتھ ملایا اور اپنی منوا کے ہی چھوڑ تھی۔

ملک کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود جھگی وغیرہ میں نہیں رہتے تھے۔ اماں کی ساری زندگی کی جمع پونجی یہ دو کمروں کا گھر تھا۔ جسے اماں نے بڑے چاؤ اور شوق سے بنایا تھا۔ اسی طرح اس کا نام بھی کوئی پروین، نسرین یا پھاتا یا شریفاں ٹائپ ہونا چاہئے تھا مگر ہوا یوں کہ اماں کو فلموں کا بہت شوق تھا۔ انہیں اداکارہ ”مونہ“ بڑی پسند تھی جب ان کے ہاں یہ پیدا ہوئی تو اماں نے فوڈ شوق اور عقیدت میں مونی نام رکھ دیا جس پر خاصی لے دے بھی ہوئی مگر اماں کو اپنے موقف سے کوئی نہ ہٹا سکا۔

میٹرک کا امتحان دینے تک اس کی گھر میں دلچسپی صرف اتنی سی تھی کہ اماں کو لسی بنا کر دے دی یا جھاڑو پونچھا کر دیا۔ اماں بھی قصداً خاموش رہیں مگر جونہی امتحان ختم ہوئے انہوں نے کمر کس لی اور یوں وہ ان کے قابو میں ایسی آئی کہ جب تک امور خانہ داری میں طاق نہ ہو گئی اماں کے شکنجے سے رہائی نہ پاسکی۔

یوں تو اس کی زندگی کے ہر پہلو پر فلمی رنگ غالب رہا تھا مگر شاہ نواز کا اس کے ساتھ بتلائے محبت ہو جانا سب سے زیادہ فلمی لگتا تھا۔ کہاں وہ لاکھوں کی جائیداد اور دو فیکٹریوں کا اکلوتا وارث اور کہاں یہ دو کمروں کے کچے گھر میں رہنے والی..... اس میں سر اسر شاہ نواز کا ہاتھ تھا۔ اس نے مونی کو پہلی بار چھت پر ٹہلتے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ وہ مونی کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ سراپا حسن و ناز تھی۔ چوڑی دارنگ پاجامے اور لمبی قمیض میں بڑا سادو پٹہ پھیلائے وہ اسے کوئی اپسرا لگی۔ شاید یہ نوعمری کے جذباتی پن کا نتیجہ بھی تھا۔

اس کے بعد دن ایک کے بعد ایک کر کے گزرتے گئے اور وہ اپنے جذبات و احساسات میں زیادہ سے زیادہ سنجیدہ ہوتا گیا۔ وہ نیچے صحن میں کوئی کام کر رہی ہوتی یا چھت پر ٹہل ٹہل کر کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف ہوتی۔ وہ کھڑکی سے تھوڑا سا پردہ ہٹا کر اسے دیکھتا رہتا۔ وہ عموماً چوڑی دار پاجامے زیب تن کرتی جو اس کے مناسب قد و قامت کی دلکشی اور بھی بڑھا دیتا۔ وہ اسے دیکھتا اور پہلے سے بڑھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا۔ دوسرے اس کو مونہنی کا لہجہ بہت پسند تھا جب وہ اسے ”تو“ کہتی تو شہر کے مہنگے ترین ادارے میں پڑھنے والا شاہ نواز جہاں صرف ”ایٹی کیٹس“ پر روزانہ لیکچر دیا جاتا ہے۔ سارے اسباق بھول جاتا۔

اسے لگتا وہ اس کے دل کے اور بھی نزدیک آ گئی ہو۔ وہ ہنستی تو اسے لگتا شیشے کی میز پر ڈھیر ساری کالج کی چوڑیاں گر کر بج اٹھی ہوں۔ محبت بڑھتی جاتی تھی اور بڑی پاکیزہ محبت تھی ان کی..... بڑی خالص..... وہ گھنٹوں ساتھ بیٹھے ڈھیروں باتیں کرتے تھے مگر ایک محدود فاصلہ ہمیشہ درمیان موجود رہتا۔ وہ اسے دیکھتا رہتا اور دل تھا کہ سیراب نہ ہوتا.....

محبت بس محبت تھی۔ ہوس نہ بنی تھی..... تو اس میں دخل دونوں کی بہترین تربیت کا تھا۔

لکیریں اور تقدیریں ساتھ ساتھ چلتی ہیں کبھی ایک حاوی ہو جاتی ہے تو کبھی

”اچھا ٹھیک ہے“ وہ آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ گئی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے کندھوں سے نیچے آتے بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں جکڑا اور ناشتہ کرنے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اماں برقع اوڑھ کر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور سیدھی کچن میں آگئی۔ بھنڈیاں پکانی تھیں۔ اس نے کڑاہی چولہے پر رکھی اور آغاز کر دیا۔ جب تک بھنڈیاں پکیں وہ پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔ اس نے احتیاط سے کچن کا دروازہ بند کیا اور کمرے میں آگئی۔ ٹرنک کھول کر سفید بے داغ پاجامہ جس کے ساتھ گلابی پھول دار قمیض اور دوپٹہ تھانتھب کیا اور نہانے چلی گئی۔ نہانے کے بعد وہ اپنی سیاہ قمیض لے کر بیٹھ گئی جس پر وہ ست رنگی پھول کاڑھ رہی تھی۔ ابھی اس نے دو تین ٹانگے ہی بھرے تھے کہ دروازہ بہت زوردار طریقے سے دھڑ دھڑایا گیا۔ وہ ڈر گئی اس نے فریم ایک طرف پھینکا اور دوپٹہ سر پر اوڑھتی چل پھرتی باہر آگئی۔

”جی کون.....“ اس نے پوچھا۔

”یہ کریم الدین کا گھر ہے؟“ باہر سے پوچھا گیا۔

”ہاں۔ کیوں؟“

”دروازہ کھولو بی بی۔ ان کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔“

”یا اللہ“ اس نے دھڑکتے دل کو تھاما اور دروازے کے دونوں پٹ وا کر دیے۔ وہ تین چار آدمی تھے جنہوں نے ابا کو کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر صحن کی دیوار کے ساتھ لگی چارپائی بچھائی اور ابا کو لٹا دیا۔

”بڑا خطرناک حادثہ تھا جی۔ دماغ پر چوٹ آئی تھی۔ بچایا نہیں جا سکا۔“ ان میں سے کوئی ایک کہہ رہا تھا۔

وہ سائیں سائیں کرتے ذہن کے ساتھ ابا کو دیکھ رہی تھی۔ ارد گرد کے ہمسائے اور خواتین اکٹھی ہو رہی تھیں۔ عجیب سی کیفیت تھی اس کی۔ اسے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ بس وہ یک ٹک ابا کے بے جان وجود کو دیکھتی آ جا رہی تھی۔

دوسری..... ایک غالب..... ایک مغلوب اور ان کے لیے تجربہ گاہ..... بس ایک معصوم زندگی..... اور انسان کتنا احمق ہے سمجھتا ہے تقدیر کو لکیروں میں لیے بیٹھا ہے جب چاہا بدل ڈالی مگر ایک اندھا موڑ ایسا آتا ہے جب وہ جان جاتا ہے لکیریں اور تقدیریں کیسا عجیب کھیل کھیتی ہیں۔ وہ جان جاتا ہے انسان تو کچھ بھی نہیں جو ہے وہ ازل سے مقوم کر دیا گیا ہے وہ دونوں بھی اس حقیقت سے بے خبر تھے۔

☆☆☆

”مون! اری او مون! اٹھ جا۔ دن چڑھ گیا کب تک پڑی رہے گی نیستیوں کی طرح“ اماں نے اسے تیسری بار جگایا مگر وہ ہنوز خواب خرگوش میں گم تھی۔

”کیا ہے اماں! سونے دو.....؟“ وہ کروٹ بدل کر پھر سے غافل ہو گئی۔ تھک کر انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور خود اٹھ کر گھر کے کام نمٹانے لگ گئیں۔ جب سورج کی تپش چھٹی تو آنکھ ناچار کھولنی ہی پڑی۔ طویل سانس لے کر چادر ایک طرف پھینکی اور اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ اماں زمین پر چٹائی بچھائے سبزی چھیلنے میں مصروف تھیں۔ وہ دھیان دیے بغیر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

”اٹھ گئی نواب زادی؟“ انہوں نے طنز سے کہا۔ وہ بند آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔

”خود ہی تو کہتی ہیں اماں پتا نہیں اگلے گھر جا کر یہ عیش و آرام ملے نہ ملے۔ اب یہاں تو سونے دیں“ اس نے اگے گھر پر زور دیا۔

”کہا تھا لیکن یہ مطلب..... میں اس کا کہ تو آدھا دن مردوں سے شرط باندھ کر پڑی رہے“ وہ جھلا کر بولیں۔

”اب مجھے تو مطلب نہیں پتا تھا“ وہ شرارت سے بولی۔ وہ بھی ہنس دیں۔

”اچھا اب اٹھ جا۔ روٹی کھالے پھر یہ سبزی پکا لینا“ انہوں نے کہا۔

”آپ کہیں جا رہی ہیں؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ عنایتاں کے ساتھ جانا ہے۔“ انہوں نے پڑوسن کا نام لیا۔

جانے کون کون آیا تھا.....؟ رونے پینے کی آوازیں بتدریج بلند ہوتی گئیں اور پھر اماں آگئیں۔ چیخ چیخ کر روتی ہوئی۔ ان کے بین جیسے کلیجہ چھلنی کر رہے تھے۔ وہ بے جان قدموں سے زمین پر گر پڑی اور اگلے ہی لمحے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو سب ختم ہو چکا تھا۔ وہ باپ کی شفقت سے محروم ہو چکی تھی۔ صدمہ اتنا جان لیوا تھا کہ رو رو کر وہ آدھی ہو گئی مگر سنبھلنا تو تھا شاید اک دو بے کے لیے یا شاید اپنے آپ کے لیے۔

چھتار جیسے ابا کے بعد جانے زندگی کا کیا رخ ہو گا؟ دن جیسے پہاڑ سے لے ہو گئے۔ کالے کتے ہی نہ تھے..... وہ گم صم بیٹھی روتی رہتی۔ سوئم کے بعد خالہ زبیدہ جو کہ لاہور سے آئی تھیں، اماں کو چپکے سے چھوٹے کمرے میں لے گئیں اور بند کمرے میں خالو اکرم کے ساتھ جانے کیا بات چیت ہوئی جس کے نتیجے میں اگلے روز اماں نے سامان سمینا شروع کر دیا۔

”اماں! ہم کہیں جا رہے ہیں؟“ وہ انجانے خدشوں سے لرز کر بولی۔ اس دشمن جاں سے دوری کا تصور محال تھا مستزاد وہ شہر سے باہر بھی تھا۔ اماں خاموشی سے ٹرک میں کھڑ پڑھتی رہیں۔

”آپ بتا کیوں نہیں رہیں؟“ وہ وحشت زدہ ہوئی۔

اماں نے اپنی مصروفیت موقوف کر دی اور اس کی طرف مڑیں۔ پیار سے اس کے ماتھے پر گرے بال ہٹائے اور اسے لے کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ دھیرے دھیرے زمانے کی اونچے نیچے سمجھانے لگیں۔ مرد کے بغیر دو اکیلی عورتوں کا رہنا کس قدر مشکل تھا مستزاد جوان بچی کا ساتھ تھا۔ زبیدہ خالہ نے ان سے کہا تھا کہ وہ لاہور جا کر فی الحال تو ان کے ہاں رہیں گی اگر چاہیں تو اپنا گھر خرید لیں۔ وہ اس گھر کو بیچ دیں۔ پر اپنی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی بدولت اس علاقے کی مارکیٹ ویلیو میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا جس کا ثبوت تیزی سے تعمیر ہونے والے نئے گھر اور کوٹھیاں تھیں۔ خالو نے ایک ایجنٹ سے مکان بیچنے کی بات کی تھی اور اچھی خاصی قیمت ملنے کی وجہ سے اماں بھی

راضی ہو گئی تھیں۔ وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ سب سنتی رہی۔

”جدائی کی گھڑی قریب آتی جا رہی تھی اور شاہ نواز کا کچھ پتا نہ تھا۔ دو دن وہ رب سے رو رو کر دعا مانگتی رہی کہ وہ کہیں سے آجائے..... کوئی معجزہ ہو جائے مگر بے سود.....“

دو دن بعد وہ لاہور آ گئے۔ کتنا روئی تھی آخری رات اس دیوار کے ساتھ بیٹھ کر جہاں ہزاروں خوبصورت لمحے اس کے ساتھ بتائے تھے جو شہر سے دور تھا۔ آنے سے پہلے اس نے ایک ورق پر چند سطریں تحریر کیں اور اس کی کھڑکی کے کواڑ میں پھنسا دی تھیں۔

لاہور کا نام اس کے لیے اجنبی نہ تھا مگر شہر بالکل اجنبی تھا اسے لگتا وہ کسی ونڈر لینڈ میں آ گئی ہو۔ ٹریفک کا شور لوگوں کا ہجوم..... تنگ تنگ بنے مکانات..... الجھی ہوئی پیچیدہ تاروں والے کھمبے..... رات دیر تک چمکتے دسکتے رہنے والے نیون سائن لیے ہوئے یہ ”لاہور“ تھا۔

کوئی کسی کے جانے کا کب تک سوگ مناسکتا ہے۔ جینا تو پڑتا ہے جیسے موہنی کریم الدین کو جینا پڑا تھا مگر اس طرح کہ ایک ایک سانس بوجھ محسوس ہوتی۔ کتنے ہی دن تو وہ کمرے میں بند رہی مگر خالہ اور اماں کے سمجھانے پر اسے سنبھلنا ہی پڑا۔

خالہ زبیدہ کے گھر صرف تین افراد رہتے تھے۔ خالو اکرم۔ خالہ اور ان کا اکلوتا بیٹا زبیر جب کہ دو بیٹیاں بیابا جا چکی تھیں۔ زبیر ایک نجی چینل میں رپورٹنگ کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

اس دن بھی وہ چھت پر بیٹھی تاحد نظر پھیلانے ہوئے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ دل میں یادوں کی بارات اتری ہوئی تھی۔

”تجھے پتا ہے موہنی تو اس دنیا کی سب سے پیاری لڑکی ہے“ شاہ کی آنکھیں جھللا رہی تھیں۔ وہ ہنس پڑی۔ سیڑھیوں میں کھڑا زبیر ایک پل کے لیے چونکا۔ وہ تو اپنے دھیان میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ بیٹھ کر تسلی سے ایک ضروری رپورٹ فائل

کون کا ہم خیال بنا پڑا۔ انٹرکارزلٹ آہی چکا تھا۔ اب آگے داخلہ لینا تھا۔ داخلے کی ساری دوڑ دھوپ زیرے کی۔ مقامی کالج سے فارم لانے کے بعد نکل کر تے ہوئے اس نے سبجیکٹ پوچھے تو اس نے بلا تامل کمپیوٹر سائنس کا نام لے لیا۔

”امیزنگ تمہیں کمپیوٹر سائنس میں دلچسپی ہے؟“ وہ چونکا۔

”مجھے تو کمپیوٹر کی الف ب بھی نہیں آتی۔“ وہ دھیسے سے ہنسی۔ وہ ایک پل کو ساکت ہوا تھا۔ وہی کھٹکھٹاتی ہنسی جیسے کانچ کی میز پر ڈھیر ساری چوڑیاں گر کر بج اٹھیں۔

”وہ سب میں سکھا دوں گا مگر کوئی خاص محرک.....“

”نہیں ویسے ہی۔“ وہ ٹال گئی۔ نگاہوں کے پردے پر چھم سے شاہ نواز کا سراپا آن سما۔ وہ بھی تو بی سی ایس کر رہا تھا۔

اور پھر ایک حیرت انگیز زندگی شروع ہو گئی۔ کالج لائف موہنی کے لیے اتنی حیران کن اور ناقابل قبول تھی کہ بہت سے دن اسے ایڈجسٹ کرنے میں لگ گئے۔ اس نے کوئی سہیلی نہیں بنائی تھی۔ وہ درحقیقت اتنی خاموش طبع اور الگ تھلگ مزاج کی مالک تھی کہ کوئی بھی اس کے قریب نہ پھٹکتا۔ اس نے دن رات محنت شروع کر دی۔ ہر وقت پڑھنا، پڑھنا اور بس پڑھنا..... کبھی کبھی تو وہ حیران ہوتا۔

”تم پڑھنے کے معاملے میں اتنی جنونی کیوں ہو؟“ وہ سر جھکا لیتی۔

”مجھے کچھ بننا ہے۔“ پختہ عزم تھا اس کے لہجے میں۔

”پتا ہے کبھی میں بھی ایسا ہی جنونی تھا مگر اتنا تو میں نے بھی نہیں پڑھا۔“

”اپنی عادت کی بات ہے“ وہ سر جھٹکتی۔ وہ نگاہوں کے رستے اسے دل میں اتار لیتا۔

زندگی بنج جاتی تھی۔ موہنی کریم الدین وہیں تھی اس کا دل وہیں تھا۔ اتنی انجان نہیں تھی جانتی تھی کہ زیر بھی اس راہ کا مسافر بن گیا ہے جس پر وہ چل رہی ہے مگر مجبوری سی مجبوری کی تجاہل عارفانہ سے کام لیتی تھی۔ وہ اسے آس نہیں دلا سکتی تھی۔

دل پر کوئی اور قابض تھا

کرے گا مگر نظر اٹھی تو واپس نہ آ سکی۔ وہ ایک نکل اس کی سیاہ چمک دار آنکھوں اور عنابی ہونٹوں کی کھلکھلاہٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اجنبیت ایک دم سے شناسائی میں بدلی تھی۔ حیرانی، گریز اور جھجک سب کہیں جا چھپے..... وہ اپنے اندر ہونے والی تبدیلی سے حیران و پریشان تھا۔ کیسے انوکھے احساسات سے دو چار ہوا تھا۔ سمجھ نہ پایا تھا اور اس پل وہ نہیں جانتا تھا جن دلوں میں محبت گھر کر لیتی ہے وہ سمجھنے سمجھانے کی حدود سے دور نکل جاتے ہیں۔

محبت تو بس اپنی سناتی ہے
محبت تو بس اپنی راہ پر چلاتی ہے۔

وہ سراپا سا کھڑا تھا کہ کن حیرت کی وسعتوں میں گھر گیا ہے اور اس پل وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ محبت کی سلطنت ہے جہاں سے واپسی کا کوئی رستہ نہیں وہ بھی اس راہ کا مسافر بن گیا۔

☆☆☆

اماں نے خالہ سے کہہ رکھا تھا کہ ان کی نظر میں کوئی رشتہ ہو تو بتادیں۔ وہ جلد موہنی کی شادی کرنا چاہتی تھیں اور شاید خالہ بھی ان کی ہم خیال بن جاتیں اگر درمیان میں زیر نہ بول اٹھتا۔

”کیا بات کر رہی ہیں خالہ جان! اتنی چھوٹی سی ہے وہ۔ اسے پڑھائیں اس کا کیریئر سیٹ کرائیں۔ شادی کا کیا ہے ہو جائے گی۔“

”کیا بات کر رہے ہو بیٹے سفینہ اور شکیلہ کی بھی ان ہی عمروں میں شادی ہو گئی تھی۔“ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کا نام لیا۔

”وہ اور زمانے تھے اماں! اب وقت بدل گیا ہے۔ لوگ تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور پڑھی لکھی لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں باکا سا تحکم تھا اور اندر آتی موہنی کے دل میں زیر کے لیے ڈھیر سارے تشکرانہ جذبات ابھرے تھے۔ وہ خود بھی تو یہی چاہتی تھی۔

شام کو سفینہ آئی تو انہوں نے بھی زیر کی پر زور تائید کی تھی جس کے بعد اماں

وجود آزاد تھا مگر روح قید.....

وہ تو خود نامراد تھی۔ نارسا تھی۔ اسے کیا امید دلائی اور یوں زندگی بیتی جاتی تھی۔

☆☆☆

دو سال کیسے بیتے پتا بھی نہ چلا..... ان دو سالوں میں بہت کچھ ہوا تھا۔ انہوں نے علیحدہ گھر لے لیا تھا جس کا نچلا پورشن کرائے پر چڑھا دیا اور وہ خود اوپر شفٹ ہو گئے۔ اس نے دن رات محنت کی تھی۔ ٹیوشن کی، کالم لکھے، رات دیر تک جاگ کر پڑھا تب کہیں جا کر سب سنج ہو پاتا تھا اور ان دونوں سالوں میں ایک پل ایسا نہیں تھا جب وہ یاد نہ آیا ہو۔ وہ اپنے رب کے حضور سر بسجود مناجات کہ جانے کون سا قبولیت کا وقت ہو۔ لبوں پر شاہ کی سلامتی کی دعائیں آنکھوں میں موتیوں کی جھڑی اور اندیشوں اور امیدوں سے بھرا دل..... کبھی کبھی وہ ساری ساری رات روتی رہتی۔ نوافل پڑھتی رہتی۔ دعائیں مانگتی رہتی۔

”میرے اللہ میرے سوہنے رب سائیں ایک بار اس کی صورت دکھا دے۔ مولا تو احسان کر۔ میں تیری کمزور بندی، ایک بار ملا دے اس سے“ آنسو تھے کہ رکتے ہی نہ اور روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔

پر شاید قبولیت کی گھڑی دور تھی۔

زبیر اب کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس نے خالہ کو بھیجنے سے پہلے موہنی سے بات کی تھی۔ وہ چند لمحے چپ رہی پھر بولی تو الفاظ میں ٹھہراؤ اور اذیت تھی۔

”آپ کے بہت سے احسان ہیں مجھے پر.....“

”کن احسانوں کی بات کر رہی ہو؟“ زبیر غصے سے بولا۔ شاید اسے برا لگا تھا۔

”آپ مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں یا میری روح کو؟“ بڑا عجیب سوال کیا تھا

اس نے۔

”موہنی میں.....“

”موہنی مت کہا کریں مجھے“ اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔

”کیوں.....؟“

”اس کا حق صرف اس کا ہے جو میرے دل کا مالک ہے“ وہ کھل کر دو ٹوک بولی۔

”وہ گنگ رہ گیا۔“

”اب..... کہاں ہے وہ.....؟“ بڑی مشکل سے اس سے سوال کیا۔

”پتا نہیں انہوں نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔“ یہ خبر اسے ایک سال پہلے اماں سے

ملی تھی جن کو کسی جاننے والی نے بتایا تھا۔

”لا حاصل انتظار.....“ وہ پھیکے چہرے سے بولی۔

وہ یک تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا بنا پلک جھپکائے پھر زرد چہرے اور آنکھوں

میں آئے پانی کو چھپاتا تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

اگلے دن اسے تیز بخار تھا۔ اتنا تیز کہ اسے اپنا ہوش نہ رہا۔ بار بار سر پٹختا اور

بے خبری میں آنکھوں کے گوشوں سے نکلتے آنسو ماں کا جگر پانی کر گئے تھے۔

”زبیر! میرے لعل، میرے بچے بول تو سہی۔ بات کیا ہے.....؟ میرے مولا

کس کی نظر لگ گئی میرے بچے کو.....؟“ وہ رو رہی تھی۔ خالو بھی متفکر بیٹھے تھے۔ اس

نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے خالی نظروں سے چھت کو نکلتا رہا۔

”مجھے کچھ نہیں ہوا ماں! میں ٹھیک ہوں“ وہ نقاہت سے بولا۔

دو دن وہ بخار میں پھنکتا رہا پھر خود بخود سنبھل گیا مگر ایک درد تھا جس نے

مستقل آنکھوں میں ڈیرا جمالیا۔ ایک اذیت تھی جو ہر پل جان جلاتی تھی۔ ایک دیرانی

تھی جس نے دشت دل پر قبضہ کر لیا تھا اور سانس بوجھ بنا دی تھی۔

زندگی گزرنے لگی مگر اس طرح کہ وہ سانسوں کی ڈوری کھینچتا ہا کان ہوا جاتا

تھا۔ ہر رات جیسے برزخ میں کنتی اور ہر دن اذیت کا ایک صحرا لیے ہوئے طلوع ہوتا ہے۔

”وہ جو ہمارا سب کچھ ہو اور ہم اس کے لیے کچھ نہ ہوں۔ کیا اس تکلیف سے

بڑھ کر کوئی تکلیف ہے“ وہ اپنی بھی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا اور نئے سرے سے اذیت

کا شکار ہو جاتا مگر محبت تھی کہ کم نہ ہوتی..... اذیت تھی کہ بڑھتی جاتی تھی اور عشق تھا کہ

سے نکلایا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں سچ مچ تارے ناچ گئے۔ اس نے سنبھل کر سامنے کھڑے ہٹلر کو دیکھا جو جائے واردات سے فرار ہونے کی بجائے وہیں جما ہوا تھا۔ اس نے نظر اٹھائی اور پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کچھ یہی حال اس اجنبی کا تھا۔ بلیک جینز اور براؤن جیکٹ میں بلاشبہ وہ ”شاہ نواز“ ہی تھا جو پہلے سے بڑھ کر شاندار نظر آ رہا تھا۔

”شاہ!“ اس کے لبوں نے بے آواز حرکت کی اور دو موتی اس کی آنکھوں سے نکل آئے۔

”موہنی!“ وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ بے اختیار اس نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر دھرے اور شاید اس کے ہونے کا یقین کرنا چاہا۔ یہ ایک بے حد مصروف اور معروف اخبار کا دفتر تھا جس کا ماحول کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا کہ عموماً اخبارات کا ہوتا ہے اور آمدورفت ہر وقت رواں دواں ہوتی ہے۔ اس وقت سب لوگ کام چھوڑے انہیں دیکھنے میں مصروف تھے۔

شاہ نواز نے بڑی تیزی سے ہاتھ واپس ہٹائے اور ماحول کا وقوف حاصل ہوتے ہی ایک خجالت سی اس پر طاری ہوئی اگلے ہی لمحے وہ دونوں باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں شاہ نواز کے فلیٹ پر موجود تھے۔ یہ ایک شاندار بلڈنگ کی تیری منزل پر واقع تھا۔

وہ بیڈ پر بیٹھی تھی اور وہ اس کے پیروں میں بیٹھا تھا اس نے پیر ہٹانے کی کوشش کی مگر نا کام رہی۔ شاہ نواز کے ہاتھ سختی سے اس کے پیروں سے لپٹے تھے اور آنسو قطار در قطار اس کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

”موہنی! مجھے معاف کر دو..... میں دو سال سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں..... چپا چپا چھان مارا اس شہر کا..... کتنا تڑپا ہوں..... سب سے جدا ہو کر یہاں پڑا ہوں..... صرف تمہارے لیے..... موہنی مجھے معاف.....“ شاہ نواز کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔ ”کس بات کی معافی.....؟“ مسلسل گریہ وزاری سے اس کی آواز بھاری

اپنی آگ میں جلائے جاتا۔

☆☆☆

موہنی نے صرف بی سی ایس پر بس نہ کیا تھا۔ اماں کے لاکھ منانے، منٹیں کرنے کے باوجود اس نے ایم سی ایس میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اب وہ اس پر شادی کے دباؤ ڈالتی تھیں۔ لاہور آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی اس نے اماں کو شاہ نواز کے بارے میں بتا دیا تھا۔

وہ دسمبر کی ایک خنک اور بریلی شام تھی۔ اسے اپنا ہفتہ وار کالم جمع کرانے کے لیے ”صدائے پاکستان“ کے دفتر جانا تھا۔ کاؤنٹر پر بتانے کے بعد وہ ایڈیٹر کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس کی چال ست اور لڑکھرائی ہوئی تھی۔ رات سے اس کی طبیعت کافی ناساز تھی۔ دل ایک پل نہ ٹھہرتا تھا۔ بے قراری عروج پر تھی۔ وہ ساری رات نوافل پڑھتی رہی۔ آنسو تو پہلے ہی جاں نثار دوست تھے۔ فوراً ساتھ دیتے، غم ہٹانے آ جاتے۔ ایک دعا مستقل لبوں پر آٹھہری تھی۔

”اے اللہ تیرا فرمان ہے تو انسان کو اس کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ اب اور نہیں سہا جاتا۔ مولا مجھ پر کرم کر، مجھے معاف کر دے۔ مجھے اور نہ آزما..... اب ہمت نہیں ہے۔ میرے مالک حوصلہ ختم ہونے کو ہے۔ میرے رب ایک بار..... صرف ایک بار شاہ کی صورت دکھا دے۔ میرے شاہ کو مجھ سے ملادے۔“ وہ سسکتی رہی..... آنسو چہرے کو بھگوتے رہے۔ ہر طرف وہ نظر آ رہا تھا ہر سو اس کے رنگ بکھرے تھے۔ ہنستا ہوا، مناتا ہوا..... اس پر والہانہ نثار ہوتا ہوا..... بڑی مشکل سے رات کٹی تھی۔ ایک پہاڑ سا طویل دن پھر منہ کھولے کھڑا تھا۔ وہ کسی ہانپے ہوئے بار بردار جانور کی طرف محنت و مشقت میں لگ گئی کہ زندگی تو ہر حال میں گزرتی تھی اور زندگی کے لوازمات بھی پورے کرنے تھے۔

وہ ایڈیٹر کے کمرے کی طرف بڑھی اور اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہوتی کوئی بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آیا اور اپنی جھونک میں پوری قوت سے موہنی

”میں نہیں آسکا..... مجھے کیا پتا تھا کہ دو ہفتوں کے لیے نہیں دو سال کے لیے تم سے دور جا رہا ہوں..... مجھے کیا پتا تھا.....“ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹا اور بیڈ کی پٹی سے سر نکال دیا۔

”موہنی!“ وہ بند آنکھوں سے بولا۔ آنکھوں کے گوشوں سے نکلتے آنسو کپٹی میں جذب ہو رہے تھے۔

”ہوں“ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی بنا پلک جھپکائے..... کسی مجسمے کی طرح.....

”میری بیوگی؟“ وہ آنکھیں کھول چکا تھا۔

”میں تو ہمیشہ تمہاری ہوں“ وہ اتنی دھیمی آواز میں بولی کہ وہ بمشکل سن سکا۔

”میرے پاس زیادہ کچھ نہیں ہے۔ پاپا نے مجھے عاق کر دیا تھا۔ میں ایک کالج میں کمپیوٹر سائنس پڑھا رہا ہوں“ بتاتے ہوئے اس کا لہجہ کسی بھی قسم کا تاثر سے عاری تھا۔

وہ اسی طرح دیکھتی رہی۔

”کیا اس سے فرق پڑتا ہے؟“ وہ سوال کرنے لگی۔

”نہیں“ وہ بولا پھر اس نے کہا ”آؤ تمہیں گھر چھوڑ دوں“ وہ اٹھ گیا۔ موہنی کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چلتی گئی۔ بایک پر اس کیساتھ بیٹھی۔ وہ اسے رستہ بتاتی رہی۔ گھر پہنچ کر وہ اسے ساتھ لے گئی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ سیدھے لاؤنج میں پہنچے۔ اندر داخل ہو کر وہ چوکی۔ صوفے پر زیرِ براجمان تھا۔ اس واقعے کے بعد وہ آج آیا تھا۔ ان دونوں کو اندر آتے دیکھ کر وہ چونکا۔ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

موہنی نے اسے قصداً نظر انداز کر دیا۔ اسی وقت اماں اندر آ گئیں۔

”اماں! پہچانیں ذرا.....“ وہ مسکرا کر بولی۔ شاہ نواز آگے بڑھا اور اماں کے سامنے ذرا سا جھکا۔

”السلام وعلیکم! میں شاہ نواز ہوں آنٹی“

اماں نے حیرت آمیز خوشی کی ملی جلی کیفیت میں اس کا ماتھ چوما۔

”کیسے ہو بیٹا؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”فرسٹ کلاس۔ آپ کیسی ہیں؟“ وہ بولا۔

”بیٹھو بیٹا.....“ انہوں نے خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

زیر اس سارے قصبے کے دوران خاموش کھڑا تھا۔ نادان نہیں تھا فوراً جان گیا تھا کہ وہ شاہ نواز ہے جو مقدر کا بھی شاہ ہے جب ہی تو اس کو ہر آبدار کا مالک ہے۔ اس کی چمک دار آنکھیں اور کھلی کھلی مسکراہٹ زیر کو سب سمجھا گئی تھی۔ ایک دم اسے لگا تھا کہ اس سارے منظر نامے میں اس کی ضرورت کہیں نہیں تھی۔ وہ شاید خاموشی سے پلٹ جاتا اگر خالہ جان اسے نہ روک لیتیں۔

”نواز بیٹا! یہ زیر ہے۔ میری بہن کا بیٹا“ انہوں نے تعارف کی رسم نبھائی۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔

”چلتا ہوں خالہ جان! ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ آپ سے پھر ملاقات ہوگی نواز صاحب“ وہ شائستگی سے کہتا کسی کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے باہر نکل آیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے جانے کیوں آنکھوں میں ڈھیر ساری دھند اتر آئی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے سر نکائے موہنی نے مسکراتے ہوئے شاہ نواز کو دیکھا۔ دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔

صرف ایک ہفتے کے قلیل انتظار کے بعد وہ دلہن بنی اس کی خواب گاہ میں موجود تھی۔ شادی کی تقریب بے حد سادگی سے انجام پائی تھی جن میں شاہ نواز کے چند دوست اور موہنی کے اہل خانہ شامل تھے۔ چیدہ چیدہ افراد شامل تھے۔

شاہ نواز نے آنسو سے دروازہ بند کیا اور چلتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ آہستگی سے اس کے سامنے بیٹھنے ہوئے اس نے اس سرپا ناز کو نگاہوں کے رستے دل میں

نواز کی نظریں اس کے نقوش میں..... گزرے چند دنوں میں وہ حسین تر ہو گئی تھی یا شاید یہ اس کی آنکھوں کا دھوکہ تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک کئی گناہ بڑھ گئی تھی اور عنابی لبوں پر ہمہ وقت ایک پوشیدہ مسکان محسوس ہوئی۔

”کون سی.....؟“ وہ اپنے دھیان سے چونکا۔

”بہی کہ آپ میرے آنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟“ وہ ابرو اچکا کر بولی۔

”سب کچھ کرتے تھے بیگم جانی! آپ نے ہمیں کسی کام کا نہیں چھوڑا

بقول شاعر۔

عشق نے غالب نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

”اچھا.....“ وہ ہنسی۔ ”اس عشق نے تب نکما نہیں کیا جب آپ ایم سی ایس

کر رہے تھے اور نہ تب جب یہاں لیکچرر کی جاب ملی..... یہ ساری نوازشیں ہم غریبوں پر نہ کریں“ وہ پھر ہنسی تھی۔

وہ چند لمحے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

”ناشتہ کر لیں“ وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ وہ گنگناتا ہوا اس کے

پیچھے چل دیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ گھریلو امور نمٹانے میں مصروف ہو گئی۔ آدھے گھنٹے

میں ہی فارغ ہو چکی تھی۔ بیڈ پر آ کر بیٹھتے ہوئے اس کے ذہن میں گزرے دنوں کی

ریل سی چل رہی تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ اسے لگتا کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ اس کی ہر

سانس رب کے حضور شکر کا سجدہ ادا کرتی۔ وہ اسے دیکھتی اور رب کی مہربانی پر آنکھیں

بھرتیں۔ اس کے روئیں روئیں سے شاہ نواز کے لیے دعائیں نکلتیں۔

اگرچہ خالہ جان اس شادی کی سب سے بڑی مخالف تھیں۔ انہیں موہنی کو زبیر

کے لیے مانگنا تھا مگر اماں نے کوئی ہاتھ پلہ ہی نہ پکڑا۔ ان کو یہ اختلاف بھی تھا کہ ایسا

لڑکا جس کے نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ اسے لڑکی دینے کی ایسی کیا مجبوری تھی.....؟ مگر اماں

اتارا۔ وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ ساری دنیا کی حسین ترین لڑکیوں سے زیادہ حسین..... اس کا دل دیوانہ وار رقص کرنے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر سب کو بتائے کہ اس نے اس گویا ہر آبدار کو پالیا۔ اس سچے موتی پر اب صرف اس کا حق ہے۔ اس کی زندگی کی سب سے خوبصورت اور خاص رات بڑے انتظار کے بعد آئی تھی جس کے لیے اس نے کتنے کشت اٹھائے تھے۔ کتنی آزمائشوں سے گزرا تھا مگر مشکلات سے گزرنے کے بعد ملنے والی خوشی کتنی دیر پا اور سچی ہوتی ہے اس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا۔

یہ صرف دو دلوں کا اتصال نہیں تھا۔ یہ دو روحوں کا ملن تھا جو ازل سے بچھڑ گئیں اور زمین پر مل گئی تھیں۔

کون کہتا ہے محبت ملن سے ختم ہو جاتی ہے.....؟ کون دعویٰ کرتا ہے وصال محبت کو مٹا دیتا ہے.....؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے.....؟ محبت تو بس بڑھتی ہے بڑھتی ہی جاتی ہے اس کی قسمت میں صرف بڑھوتری ہے۔

موہنی کو کالج سے دسبر کی چھٹیاں ہو چکی تھیں جب کہ شاہ نواز کی بھی چھٹیاں آج ہو رہی تھیں۔ وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ آئینے میں بال بناتے ہوئے اس نے موہنی کو دیکھا جو ٹائیٹھ سے ڈرینگ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

”اب بس بھی کریں۔ آپ کی تو زلفیں بھی نہیں سنور رہیں“ وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

”اس سے زیادہ زنانہ اصطلاح نہیں ملی تھی آپ کو ہمارے لیے.....؟“

”تو آپ نے کون سا اثر لے لیا ہے؟“ وہ اسے بدستور مصروف دیکھ کر تنک کر بولی۔

شاہ نواز نے ہنستے ہوئے برش رکھا اور اس کی طرف مڑا۔ موہنی اسے ٹائی باندھنے لگی۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی.....؟“ وہ ٹائی سے الجھ رہی تھی اور شاہ

”میڈیسن نہیں لیں گے تو ٹھیک کیسے ہوں گے؟“ وہ پریشانی سے بولی۔

”ہو جاؤں گا معمولی بخار ہے“ وہ اثر لیے بغیر بولا۔

مگر ہوا یوں کہ رات تک بخار مزید تیز ہو گیا۔ نقاہت کے سبب اس کی آنکھیں کھل نہ رہی تھیں۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے بے حد پریشان تھی۔ اس وقت کس کو مدد کے لیے بلائے.....؟ اماں کو فون کر دے..... مگر وہ کیا کر سکیں گی.....؟ کچھ سوچ کر اس نے شاہ نواز کا فون اٹھایا اور زیر کا نمبر ملائے گی۔

”ہیلو!“ وہ بولا۔

”میں موہنی بات کر رہی ہوں“

”موہنی..... نا..... کیسی ہو.....؟“ وہ ”موہنی“ کہتے کہتے رک کر مونا کہہ گیا اور

حیرانی سے بولا۔

”زیر! شاہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پلیر۔ آپ آجائیں“ وہ سسکتے ہوئے

بولی۔ زیر کچھ پریشان ہوا۔

”کیا ہوا اے؟“

”بخار بہت تیز ہے۔ آپ بس آجائیں“ اس کے آنسو لگا تار بہہ رہے تھے۔

”اچھا میں آ رہا تھا۔ تم روؤ مت.....“ وہ بے قراری سے بولا۔ پندرہ منٹ

بعد وہ فلیٹ میں موجود تھا۔

”اف میں تو بایک پر آیا ہوں۔ نواز صاحب آپ بایک پر بیٹھ سکیں گے؟“

وہ بولا۔

”اتنے تکلف سے تو مت بلاؤ بھی۔“ شاہ نواز نے مسکرانے کی کوشش کی

”میں بیٹھ جاؤں گا“

”آئیں پھر.....“ اس نے شاہ نواز کو سہارا دے کر اٹھایا اور بڑی احتیاط سے

ساتھ لے گیا۔ ان کے جانے کے بعد موہنی نے دروازہ بند کیا اور جائے نماز پر آ بیٹھی۔

”اے اللہ مجھ پر رحم کر مالک..... تو رحیم ہے..... تیری رحمت بے کنار ہے تو

نے تو ایسی چپ کی مہربوں پر باندھی کہ ایک لفظ پھوٹ کر نہ دیا۔ اس کے علاوہ کوئی اتنے خاص رشتے دار ہی نہ تھے جو اعتراض اٹھاتے۔

شادی کے دوسرے دن ہی شاہ نواز کا موہنی کے ساتھ پہلا جھگڑا ہوا۔

”مجھے یہ آپ جناب بالکل پسند نہیں ہے۔ مجھے پہلے کی طرح بلایا کرو“ وہ چڑ کر بولا تو موہنی حیران ہو گئی۔

”اچھا نہیں لگتا۔ وہ تو بچپن کی بات تھی“ وہ جھلا گئی۔ وہ سچ میں اپنی بات پراڑ گئی تھی اور اس نے منتیں کرنا چھوڑ دیں مگر وہ ”آپ“ سے ”تم“ پر نہ آئی جھنجلا کر وہ بھی اسے آپ کہہ کر پکارنے لگا۔

زندگی ہر لحاظ سے خوبصورت اور مکمل تھی کہیں کوئی کمی نہ تھی۔ کبھی کبھی اسے ان نعمتوں کے چھن جانے کا شدت سے ڈر لگتا۔ وہ اس کی لمبی زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں مانگتی۔ نوافل پڑھتی مگر نہ جانے کیوں دل مطمئن نہ ہوتا۔ وہ اسے وہم جان کر جھٹک دیتی۔

عام طور پر شاہ نواز دو بجے کالج سے آ جاتا تھا مگر آج گیارہ بجے ہی آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ حیران ہوئی۔

”آج اتنی جلدی.....“

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے کچھ“ وہ ست لہجے میں کہتا اندر آ گیا۔ اس نے گھبرا کر اس کا ماتھا چھو ما جو گرم ہو رہا تھا۔

”سر میں شدید درد ہے“ وہ بید پر لیٹ گیا۔

”دودھ لاؤں؟“

”نہیں۔ سر دباؤ دیر“ وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ موہنی نے اس کے شوز اتارے۔ وہ اس کے پاں بیٹھ کر سر دبانے لگی۔

”کون سا دوا لگائیں؟“

”بائبل نظر نہیں۔“ مے غفر۔ ہے مہیہ۔ نر۔ سے۔“ وہ کراہت سے بولا۔

مجھ پر کرم فرما مولا..... مجھ پر رحم کر..... میرے شاہ کو صحت و تندرستی عطا کر..... میرے رب..... مجھ پر کرم کر..... اے اللہ.....“ آنسو قطار در قطار آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ دل تھا کہ سینہ توڑ کر باہر آنے کو بے تاب تھا۔ کچھ غلط ہو جانے کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ خود پر قابو پانے میں ناکام تھی۔ تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ قیامت کے تین گھنٹے..... اس کے پاس کوئی فون نہیں تھا جس پر وہ زبیر سے رابطہ کر لیتی۔ شاہ نواز کا موبائل اس نے خود اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ اب خود پریشانی سے بے حال تھی۔ دس منٹ بعد ڈورنیل ہوئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ دروازے میں شاہ نواز اور زبیر تھے۔ شاہ نواز بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ نقاہت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ دائیں ہاتھ پر ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اس نے شکرانے کے نوافل مانے اور انہیں اندر لے آئی۔

”یہ کچھ دوائیاں ہیں۔ یہ رکھو اور کچھ ٹیسٹ ہوئے ہیں ان پر زیادہ دیر لگی۔ پرسوں تک رپورٹس آجائیں گی۔ امید ہے سب ٹھیک ہی ہوگا“ زبیر نے دوائیوں کا لفافہ اسے تھماتے ہوئے تفصیل سے کہا۔ اس نے تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا اور لفافہ تھام لیا۔

”شکر یہ زبیر..... آپ کا بہت بہت شکریہ.....“ وہ بے ساختہ بولی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

”اور آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیے نواز! ایسے بیمار آپ بالکل بھی اچھے نہیں

لگتے“ وہ ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے قصد ابولا۔

”جیسا آپ کا حکم سر!“ شاہ نواز بھی مسکرایا۔

”اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ ضرورت پڑی تو بلا لیجیے گا“ وہ نواز سے مصافحہ

کرنے لگا۔

”بالکل۔ ضرورت کے بغیر بھی بلا لیں گے۔“ نواز نے خوش دلی سے کہا۔ اس

نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ موہنی دروازہ بند کر کے لوٹی تو شاہ نواز کو

بیڈ پر دراز پایا۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

”زبیر بہت اچھا انسان ہے موہنی۔ وہ حیرت انگیز ہے“ شاہ نواز نے کہا۔

”اچھا..... تین گھنٹوں میں آپ کو پتا چل گیا.....“ وہ ہنسی پھر اس پر لحاف

درست کرنے لگی۔ ”کافی بناؤں؟ موڈ ہے.....؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”ہاں لے آؤ“ اس نے کہا۔

وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ وہ کافی بنا کے لوٹی تو وہ سوچکا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئی

پھر کپ سائیڈ ٹیبل پر دھرا اور اس کے نزدیک آ بیٹھی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں

پھیرتے ہوئے وہ کتنی دیر اس پر سورتیں دم کرتی رہی۔ اس کی ہموار اور متوازن سانس

اس کے گہری نیند میں ہونے کا اشارہ تھی۔ کچھ دیر بعد اسے خود نیند آنے لگی۔ وہ دیر تک

اسے دیکھتی رہی آنکھوں میں محبت بھرے اور نیکیے پر سر دھر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ گہری نیند

میں جا چکی تھی۔

اگلی صبح اس کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی مگر وہ زبردستی اس سے تیمارداری

کروانے کے چکر میں بسر پر پڑا رہا اور وہ پروانوں کی طرح اس کے ارد گرد منڈلاتی

رہی۔ نہیں جانتی تھی کہ مستقبل میں یہ ذمہ داری مستقل ہونے والی ہے۔ شام سے ذرا

پہلے جب وہ خود لیٹ کر تھک گیا تو وہ اٹھ ہی پڑا۔

”کہیں جارہے ہیں؟“ وہ کچن سے کھانا بنا کر لوٹی تو اسے جوتے پہنتے دیکھ

کر پوچھا۔

”ہاں ایک ضروری کام ہے“ وہ بولا۔

”طبیعت آپ کی زیادہ بہتر نہیں ہے۔ کل چلے جائیے گا“ وہ پریشان سی بولی۔

”طبیعت بالکل ٹھیک ہے میری“ وہ مسکرا کر بولا۔

”پھر بھی.....“ وہ بضد ہوئی۔

”ضروری کام ہے بیگم جانی! یہ سیل فون رکھو اور فیاض کے نمبر پر کر لینا۔ اگر

مجھے دیر ہو جائے تو..... میں وہیں جا رہا ہوں“ اس نے تفصیل سے بتایا۔ اس نے سر

کر وہ لاؤنج میں آگئی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے بیٹھتے ہی بے تابی سے پوچھا۔

”دیکھو جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، اسے بہت حوصلے اور صبر کیساتھ

سننا میں.....“ وہ رک گیا۔ کچھ دیر پریشانی سے ہونٹ چبا تا رہا۔ موہنی کا ضبط جواب دینے لگا۔

”آخر بتاتے کیوں نہیں ایسی کیا بات ہے؟“ وہ پھٹ پڑی۔

”کل جب میں شاہ نواز کے ساتھ گیا تھا تو چند دوسرے ٹیسٹوں کے ساتھ بلڈ

ٹیسٹ بھی ہوا۔ ڈاکٹر یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کہیں ٹائیفائیڈ کے جراثیم تو موجود نہیں.....

تمہیں تو پتا ہے یہاں فضول دس قسم کے ٹیسٹ لکھ دیے جاتے ہیں۔ آج صبح جب میں

ٹیسٹ کی رپورٹس لینے گیا تو ڈاکٹر نے بڑی عجیب بات کہی۔ اس نے کہا کہ میں ان

رپورٹس کو کسی Oncologist کے پاس لے جاؤں تصدیق کے لیے.....“ وہ رک گیا۔

شاید حوصلہ ختم ہو گیا تھا۔

”اونکا لو جسٹ کے پاس کیوں.....؟“ موہنی کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔

”میرے دوست کا واقف کار ہے ڈاکٹر فرقان..... وہ اپنا پرائیویٹ ہسپتال

چلاتا ہے۔ میں اس کے پاس لے گیا تھا رپورٹس..... اور.....“ اس نے زبان خشک

لبوں پر پھیری۔

”آخر ایسا کیا ہے ان رپورٹس میں.....؟ اس نے خوف ناک اندیشوں کو پس

پشت ڈالنا چاہا۔

”میں نے صرف اس کی تصدیق پر اکتفا نہیں کیا۔ میں نے لندن میں

کرامویل ہسپتال کو یہ رپورٹس میل کی تھیں اور ڈاکٹر ایڈورڈ نے بھی اس کی تصدیق

کردی ہے کہ مونا..... شاہ نواز کو زمنل بلڈ کینسر ہے“ زیر نے سارا حوصلہ مجتمع کر کے

کہہ دیا۔

موہنی کو جھکا لگا۔ شدید شاک کی کیفیت نے جیسے اس سے سوچنے سمجھنے کی ہر

بلا کرفون پکڑ لیا۔

”کتنی دیر لگے گی؟“

”آٹھ بجے تک آجاؤں گا“ اس نے گھڑی دیکھی۔

”اتنی دیر.....“ وہ خفا ہوئی۔

”کھانا تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گا۔“ اس نے اطمینان دلایا تو وہ مسکرا دی۔

”اور ہاں ذرا اچھی طرح تیار ہونا۔ گیارہ دن ہی تو ہوئے ہیں ہماری شادی

کو اور تم یوں فضول سے حلیے میں گھوم رہی ہو“ اس نے تنقید کی۔

”جو حکم سرکار!“ وہ بولی۔

”اچھا۔ اب دروازہ بند کرو“ وہ باہر نکل گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔

واپس آکر بیڈروم میں بیٹھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے جب سیل فون کی ٹون بجنے

لگی۔ اس نے اسکرین دیکھی تو نمبر زیر کا تھا۔

”ہیلو السلام وعلیکم!“ وہ فون اٹھا کر بولی۔

”وعلیکم السلام! کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”نواز کیسا ہے اور کہاں ہے؟“ وہ غلٹ میں پوچھ رہا تھا۔

”وہ ٹھیک ہیں اور ذرا کام سے باہر گئے ہیں“

”کہاں..... کب تک آئے گا؟“

”کہہ رہے تھے کہ آٹھ بجے تک آؤں گا۔“

”اچھا۔ میں آ رہا ہوں مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے جس کے لیے میں آ رہا ہوں“

غیر موجودگی ہی بہتر ہے۔“ وہ حیران ہوئی۔

”ایسی کون سی ضروری بات ہے؟“ اس نے پوچھا مگر زیر نے ہلکا سا ہنسنے لگا۔

پندرہ منٹ تک وہ سوچتی رہی کہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے مگر اسے کچھ سمجھ نہ آ سکا۔ چند

سیکنڈز بعد ڈور بیل بجی۔ اس نے تیز قدموں سے چلتے ہوئے دروازہ کھولا۔ زیر کو لے

”کرامویل ہاسپٹل سے اس کی تصدیق کی جا چکی ہے وہاں کے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ طبعی لحاظ سے ختم ہو چکا ہے یا یوں سمجھ لیں کہ بونس میں جی رہا ہے۔ اس قسم کے کیسوں میں مریضوں کی قوت ارادی اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن ایک حد تک..... شاہ نواز اندرونی طور پر بہت مضبوط ہے جب ہی اب تک وہ ان ظاہری علامات سے بھی بچا ہوا تھا جو کہ اس خطرناک اسٹیج پر آکر لازمی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ مگر قوت ارادی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب..... تم یوں سمجھ لو کہ وہ حد ختم ہو چکی ہے اور اس کا پہلا ثبوت یہ بخار ہے اب آگے کا مرحلہ کتنا خطرناک اور تکلیف دہ ہوگا۔ کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ وہ بات کرتے کرتے رکا۔ وہ خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”ہم اسے لندن لے جائیں گے؟“ وہ اس سے بولی۔

”کوئی فائدہ نہیں“ زبیر نے نفی سے سر ہلایا۔ ”پاکستان میں ایک سے بڑھ کر ایک اونکا لوجسٹ بیٹھا ہے اگر ہم اسے کہیں باہر لے جاتے ہیں تو اس سے صرف اتنا ہی ہوگا کہ اس کی تکلیف اور اذیت سے بھرا یہ عرصہ کچھ اور لمبا ہو جائے گا“ اس کی آنکھوں کی دیرانی زبیر کے دل کو چیر رہی تھی۔

”کوئی اور طریقہ علاج..... بھی تو ہوگا“ وہ سن دماغ کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں..... بالکل ہیں اور لوگ آزما رہے ہیں۔ ہومیو پیتھی، حکمت، آیورویدک، آکوپنچر وغیرہ وغیرہ..... پیروں فقیروں کے پاس بھی جانتے ہیں لوگ..... مگر اس سے کیا فائدہ.....؟“

”آپ کا مطلب ہے ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے“ وہ وحشت زدہ ہوئی۔

”ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اس کو زیادہ سے زیادہ عرصہ بے خبر رکھیں اور اس

کا ساتھ دیں“ وہ نہایت صبر سے کہہ رہا تھا۔

”میں اسے یوں آسانی سے مرنے کے لیے چھوڑوں؟“ وہ پہلی مرتبہ بلند

آواز میں چلائی۔

”ہم صرف اس کو زیادہ سے زیادہ تکلیف سے بچانے کے لیے اقدامات

صلاحیت چھین لی تھی۔ وہ ساکت سی بیٹھی زبیر کو دیکھتی رہی..... آہستہ آہستہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ ٹرمنل بلڈ کینسر..... ایک دم اسے لگا زمین اس کے قدموں کے نیچے پلنے لگی ہو۔ اس کے ارد گرد دن کا اجالہ کم ہوتے ہوئے سیاہ خوف ناک تاریکی میں بدل گیا۔ اسے اپنے سے چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھا زیر نظر آنا بند ہو گیا۔ ہر قسم کی آوازیں معدوم ہوتی گئیں۔ یہ شدید ترین ذہنی، جسمانی اور اعصابی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ وہ تیزی سے اس کی سمت لپکا۔

”موہنی..... مونا..... اٹھو..... مونا..... حوصلہ کرو“ اس نے بے ساختہ کلائی سے تھام کر اٹھایا۔

”یہ کیسے ممکن ہے.....“

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں مونا۔ خدا کے لیے خود کو سنبھالو“ وہ پست لہجے میں بولا۔ وہ ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ حقیقت اپنی پوری کڑواہٹ کے ساتھ اس پر اثر انداز ہونے لگی۔

”اس..... کا..... اس کا..... علاج بھی..... تو ہوگا.....“ وہ بہ دقت بولی۔

”بلڈ کینسر کی کئی اقسام ہیں اور کچھ انتہائی مہلک اور ناقابل علاج ہیں۔ یہ ان ہی میں سے ایک ہے لندن میں ایک طریقہ علاج بھی ہے مگر اس میں مکمل کامیابی کا تناسب نہیں پایا جاتا۔ میں نے ہر طرح سے تحقیق کی ہے مگر افسوس..... اگر کچھ عرصہ پہلے پتا چلتا تو شاید کچھ کیا جاسکتا تھا مگر اب.....“ اس کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ موہنی کا دل جیسے اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ نیچے نیچے اور زیادہ نیچے یا پھر شاید اس کا پورا وجود ہی پاتال میں گرتا جا رہا تھا۔ وہ بے ساختہ گھٹنوں کے بل گر پڑی۔

”کہیں کوئی چانس نہیں ہے..... کوئی ایک موقع.....؟“ موہنی کے لہجے میں

درد اور اذیت کا صحرا تھا۔

زبیر نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ موہنی کا دل پھٹنے لگا۔

مرحلہ تو اور زیادہ جان لیوا ہوگا۔ ہمیں اسے اسلام آباد شفٹ کرنا پڑ سکتا ہے جہاں اسے مسلسل Saditives کے زیر اثر رکھا جائے گا“ وہ کہہ رہا تھا ”خود کو سنبھالو..... موہنی! تمہیں اس کے سامنے کمپوز رکھنا پڑے گا خود کو..... اسے مزید ڈپریشن اور فرسٹریشن سے بچانے کے لیے..... اگر تم نے خود پر سے ضبط کھود دیا تو وہ جلد ہمت بار دے گا..... اس کی زندگی کے آخری دن اس کے لیے مشکل مت بنانا“ زیر کہتے کہتے پھر رو دیا۔

”وہ بہتی آنکھوں اور سن ذہن کے ساتھ سب سنتی رہی۔ وہ اسے اور بھی پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ اپنی ہر طرح سے مدد کا یقین دلارہا تھا، صبر کی تلقین کر رہا تھا، حوصلہ کرنے کو کہہ رہا تھا اور وہ..... وہ بس تقدیر کے اس مذاق پر ساکت سی بیٹھی تھی۔

☆☆☆

شاہ نواز نے ڈور بیل دی اور وہ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ موہنی نے دروازہ کھولا اور ہلکا سا مسکرائی۔ شاہ نواز کو جھٹکا لگا۔ بڑے عرصے بعد وہ اپنے مخصوص چوڑی دار پاجامے اور قمیض کے ساتھ لمبے سے دوپٹے میں ملبوس تھی۔ حالانکہ کہ وہ بہت لائٹ میک اپ کرتی تھی مگر اس وقت اس نے ڈارک میک اپ کیا ہوا تھا۔ وہ مسکرتا ہوا اندر آ گیا۔

”کیا بات ہے جناب آج تو بڑے قاتلانہ موڈ میں ہیں.....“ وہ کھلکھلایا۔ وہ ہلکا سا ہنسی۔

”ہم نے سوچا آج شاہ کو خوش کیا جائے۔“

”بالکل ٹھیک سوچا۔ آج لگ رہی ہو میری موہنی“ وہ محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

موہنی کو خود پر ضبط کرنے کے لیے خاصی محنت کرنا پڑی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دھماڑیں مار مار کر روئے۔ جاہل عورتوں کی طرح اپنے بال نوچ لے یا چیخ چیخ کر بین کرنا شروع کر دے مگر..... وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا۔

”میرا کھانا کھانے کا بالکل موڈ نہیں ہے پلیز مت کہنا“

کر سکتے ہیں۔“

”کتنا..... عرصہ ہے اس کے پاس.....؟“ اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

”زیادہ سے زیادہ آٹھ سے نو بجتے..... اس سے زیادہ یا کم اس کی قوت ارادی اور ہمت پر منحصر ہے.....“ وہ نہایت ضبط سے بولا۔

وہ زرد چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی پھر ایک دم دھماڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ وہ بے ربط گفتگو کر رہی تھی۔ ٹوٹے پھوٹے بے معنی جملوں میں زور زور سے روتی وہ شاید پاگل ہو رہی تھی۔ اس بے ربط گفتگو کا کوئی سر پیر نہ تھا مگر یہ شاید اس کے جذباتی نکاس اور شدید اعصابی دباؤ کے لیے بے حد ضروری تھی۔ اس سے اس کی بھڑاس نکل جاتی اور وہ پرسکون ہو جاتی۔ کم از کم شاہ نواز کے سامنے خود کو کمپوز کر سکتی۔

وہ دیر تک روتی رہی جب سر اٹھایا تو زیر بھی سر میز سے ٹکائے بے آواز رو رہا تھا۔

”آپ..... رو..... رو ہے ہیں.....؟“

”اتنا پتھر دل نہیں ہے میرا۔ تمہیں کیا پتا صبح سے کیسے خود میں ہمت پیدا کر رہا تھا تمہیں یہ سب بتاتے کی“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

”میں کیا کروں زیر؟ خدا را مجھے کچھ بتائیں؟“

وہ پھر سے سسک اٹھی۔

”مت روؤ موہنی! خدا کے لیے..... مت روؤ..... مجھے تمہارا رونا تکلیف دیتا ہے۔“ وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ لب بھیج کر بولا۔

”ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ اسے بہت زیادہ درد ہوگا؟“ وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں سمیت پوچھ رہی تھی۔

”ہم زیادہ سے زیادہ اس کی اذیت کم کر سکتے ہیں۔“

”کیا اسے ہاسپٹلائز کرنا پڑے گا؟“ وہ اذیت سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں..... یہ بالکل آخری مرحلہ ہے اور اچانک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آخری

اس کے آنکھوں سے آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی..... ابھی تو میں نے تمہیں ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں شاہ۔ اتنی جلدی رہائی کا اذن مانگ لیا..... تم تو کہتے تھے کہ ہمیں موت جدا کرے گی اور دیکھ لو..... ایسا ہی ہو رہا ہے..... ابھی تو مجھے ایسی ان گنت خوبصورت راتیں اور روشن صبحیں دیکھنی تھی اور ایک پر مسرت عہد رفاقت کی سلور جوبی اور گولڈن جوبلی منانی تھی اور اب وہ سب..... ایک خوف ناک ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ خون دل بہتا رہا اور رات گزرتی رہی۔

اگلی صبح اس کا بخار پھر سے لوٹ آیا اور وہ خود فراموشی کی کیفیت میں پڑا کر رہا رہا۔ موہنی نے زیر کوفون کر دیا تھا اور اسے ڈاکٹر فرقان کے کلینک ایڈمٹ کر دیا گیا اسے مسلسل Sedation کے زیر اثر رکھا جا رہا تھا۔ اماں اور خالہ بھی اس کے پاس تھیں۔ شام کو زیر نے زبردستی انہیں گھر آرام کرنے کے لیے بھیجا۔

اسے ہوش آیا تو وہ حیران تھا۔ بے حد حیران.....

”مجھے یہاں کیوں لائے ہو تم سب.....؟ اور یہ ڈرپس یہ..... سب کیا ہے؟“ معمولی بخار ہے ہم ڈرپس کے ختم ہوتے ہی یہاں سے چلے جائیں گے.....“ موہنی اسے بچوں کی طرح بہلاتی رہی۔

رات کے آخری پہر اس کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔ زیر مسلسل اس کے ساتھ تھا۔

”انفیکشن بڑھ رہا ہے..... فی الوقت تو کنٹرول کر لیا گیا ہے..... آپ ٹینشن مت لیں“ ڈاکٹر فرقان تسلی آمیز انداز میں اور کسی حد تک پیشہ ورانہ طریقے سے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ اور زیر کمرے میں آئے تو وہ فرنگو لائزر کے زیر اثر سو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی سمت بڑھی اور اس کا کمزور ابھرتی نسوں والا ہاتھ تھام کے رونے لگی۔

”میں کیا کروں زیر..... میرا شاہ..... لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے.....“

”مجھے بھی بھوک نہیں ہے“ وہ ہلکا سا مسکرائی پھر نہایت باریک بینی سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ اس ظاہری شکل و صورت میں کہیں بھی اس خوف ناک مرض کی علامات نظر نہیں آتی تھیں۔

”لے لیا میرا جائزہ.....؟“ وہ مسکرا کر بولا۔ وہ جھینپ گئی۔

”شاہ ایک بات پوچھوں؟“

”ہوں.....“

”کچھ نہیں“ وہ ٹال گئی۔

رات بہت خوبصورت اور خوابناک تھی وہ دیر تک جاگتے رہے، باتیں کرتے رہے، آخر تھک کر شاہ نے کروٹ لی اور غافل ہو گیا۔ وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ چھت کوکتی رہی۔

دو سالوں کا کسٹ..... اور صلہ صرف گیارہ دن کی رفاقت صرف یہی تو مانگا تھا میں نے رب سے..... وہ مجھے صرف ایک بار شاہ سے ملاوے..... بس..... تو رب کریم نے دعا قبول کی.....

”اے اللہ“ اس کی نظر سامنے کیلنڈر پر پڑی اور رات کی تاریکی اس کی آنکھوں میں اتر آئی..... آٹھ ہفتے..... آج کیا تاریخ تھی..... تیس دسمبر..... اس کی نظروں میں ایک اور تاریخ گھومی..... آٹھ ہفتوں بعد والی..... تیس فروری..... اور پھر..... سب ختم..... رفاقت کا وہ سفر جو ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا..... ختم..... اور شاہ نواز کا جیتا جاگتا وجود بے کراں تاریکی میں منوں مٹی تلے دفن..... اسے کچکی چڑھ گئی۔ اس نے پورے حواس میں موت کی اذیت اور ہڈیوں تک اتر جانے والی خنکی کو محسوس کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کا خوف، وحشت اور اذیت پوری وضاحت کے ساتھ رقم تھی۔ اس نے بے ساختہ شاہ کو دیکھا جو کروٹ کے بل گہری نیند میں تھا..... اور آٹھ ہفتوں بعد یہ وجود..... کہاں ہوگا.....؟ اس نے بے ساختہ شاہ کو بازوؤں میں لے لیا.....

”شاہ! تم یہ..... کیا کہہ رہے ہو.....؟“ وہ زرد چہرے کے ساتھ بولی۔ وہ اذیت سے ہنسا۔

”اس میں جھوٹ کیا ہے اور..... تم بھی اب اداکاری مت کرو..... میں سب جان چکا ہوں..... کل رات وہ گفتگو میں نے سن لی تھی۔

وہ ایک دم رونے لگی۔ روتے روتے اس نے شاہ نواز کا سراپے سینے سے لگا لیا۔ ضبط کا دھارا بہہ نکلا تھا۔

”مجھے یہاں نہیں رہنا..... موہنی..... مجھے گھر لے چلو.....“ وہ بھی رونے لگا۔ گھٹی گھٹی سسکیوں کے ساتھ.....

”تم نے مجھے دعا دیا شاہ! دیکھ لو مجھ سے پہلے جا رہے ہو مجھے چھوڑ کے“ میں کیا کروں..... شاہ.....“

”میں مجبور ہوں موہنی! خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں کبھی تمہیں نہ اپناتا.....“

موہنی نے بے ساختہ اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسا نہ کہو..... اللہ کے لیے.....“ وہ تڑپتی تھی۔

”میں نے تم سے بہت محبت کی ہے موہنی۔“

”یہ کیسی محبت ہے تمہاری مجھ سے..... مجھے تنہا کر رہے ہو“

”یہ میرے اختیار میں نہیں ہے موہنی“ اس نے بے تابی سے سر پٹا۔

”روؤ مت موہنی! خدا کے لیے مت روؤ۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے“ وہ اور شدت سے تڑپا۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے موہنی! میں تو بہت سکون سے مر جاتا مگر تم نے مجھے اپنی دعاؤں میں اتنا مانگا کہ موت کے منہ میں ہوتے ہوئے بھی اس رب کو مجھے تمہیں دینا پڑا۔ یہی تو مانگا تھا نا، تم نے کہ..... میں ایک بار تمہیں مل جاؤ..... بس ایک بار مل جاؤں..... دیکھو میں تمہیں مل گیا نا..... اس رب سے کوئی شکوہ نہ کرنا.....“

میں کچھ نہیں کر سکتی..... اور ایک دن وہ مجھے چھوڑ کے چلا جائے گا..... آپ نے سنا وہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا کہ..... یہ انفیکشن مزید بڑھتا جائے گا..... میرے اللہ میرے شاہ کو بچالے..... میں کیا کروں.....“ وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔

زیر تیزی سے اس کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے وہاں سے اٹھایا۔

”کیا کر رہی ہو موہنا؟“ اٹھو..... وہ ڈسٹرب ہو گا..... اٹھو.....“ وہ اسے کمرے میں پڑے کاؤچ کے نزدیک لے گیا۔ ”اگر تم خود پر سے ضبط کھودو گی تو اسے کون سنبھالے گا۔ آج نہیں تو کل وہ جان جائے گا کہ اسے ٹرمنل بلڈ کیمر ہے اور اس کے پاس بالکل وقت نہیں.....“ وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے پر خلوص لہجے میں اسے سمجھانے لگا اور یہ شاید اس کے جادوئی لہجے کا ہی اثر تھا کہ وہ بتدریج پرسکون ہوتی گئی۔

اگلی صبح وہ جاگا تو کمرے میں خواب ناک تارکی تھی۔

کھڑکیوں میں بھاری پردے گرے تھے اور خوشگوار حرارت، سننرل ہیٹنگ ہونے کی وجہ سے بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ موہنی اس کے سرہانے بیٹھی تھی اس کا ہاتھ تھامے.....

”صبح بخیر زندگی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”زندگی.....“ وہ افسردگی سے ہنسا۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم جلد یہاں سے چلے جائیں گے“ وہ اسے تسلی دینے کو بولی۔ وہ ہنسا..... چند دنوں میں ہی اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

”ہاں۔ چلے جائیں گے..... کہاں.....؟ وہ تڑخا تھا۔

”اپنے گھر اور کہاں.....؟“ موہنی نے آنسو چھپائے۔

”نہیں..... وہاں تو صرف تمہیں جانا ہے۔ مجھے تو کہیں اور جانا ہے.....“

اندھیری اور تاریک قبر میں.....“ وہ سفاکی سے بولا۔

موہنی پر جیسے بجلی گری۔

خاموشی سے بیٹھی نادیدہ خلاؤں میں گھورتی رہتی۔

پتا نہیں اس نے کتنا عرصہ اس دیوانگی کی کیفیت میں گزارا تھا۔

ایک دن زیر آیا اس کے پاس۔ ڈھیر ساری باتیں کرتا رہا۔ اس کا دل بہلانے والی..... اس کو ہنسانے والی باتیں..... وہ بھی دھیرے دھیرے سنبھلتی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ زیر کیا چاہتا تھا اس دن وہ آیا تو واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔

وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”تم تقدیر پر کتنا یقین کرتے ہو زیر.....؟“

”یہی کہ جو ہماری قسمت میں ہوتا ہے وہ ہمیں ضرور ملتا ہے“ وہ یقین سے بولا۔

”تو یقین رکھو کہ اگر میں تمہاری تقدیر میں ہوں تو میرے دل میں ضرور

تمہارے لیے جگہ بن جائے گی..... میں اس دن کا انتظار کروں گی تم بھی کرو..... اور

پھر یوں ہوگا کہ ایک نئی صبح کا طلوع ہوتا سورج ہم دونوں دیکھیں گے“ موہنی نے بہت

ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

وہ چمکتی آنکھوں سے چند پل اسے دیکھتا رہا حالانکہ اس میں کچھ خاص نہ تھا، نہ

اس کے نین نقش، نہ وجاہت، وہ بہت عام سا تھا مگر اس کی آنکھیں خاص تھیں جن میں

محبت بہتی تھی۔

اور اس پل وہ آنکھیں کیسے روشن ہو گئی تھیں.....

”میں اس روشن صبح کا انتظار کروں گا موہنی“ وہ آنکھوں میں امید لیے ہوئے

گھر سے نکل آیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ جس رب نے اس کے دل میں موہنی کی محبت جگائی تھی اس

نے لازماً اسے زیر کی تقدیر میں لکھا ہوگا اسے یقین تھا..... وہ مسکراتا ہوا اپنی بانیکی

سمت بڑھ گیا۔



شاہنواز سے روتے ہوئے جیسے شکوہ کیا تھا۔

”شاہ! تمہارے والدین..... ان کو بلا لو؟“

”نہیں..... تمہیں پتا ہے انہوں نے مجھے کیوں عاق کیا تھا۔ پاپا اپنی بیٹی سے

میری شادی کرنا چاہتے تھے جب میں کسی طرح نہ مانا تو انہوں مجھے گھر سے نکالنے کی

دھمکی دی۔ میں نے خود ہی گھر چھوڑ دیا اور دونوں بعد انہوں نے نیوز پیپر میں عاق نامہ

چھپوا دیا۔ وہ نہیں آئیں گے۔ موہنی انہوں نے اتنا عرصہ میرے بغیر گزار لیا ہے تو انہیں

میری موت سے کیا فرق پڑے گا.....“ وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ اذیت سے بولا۔

موہنی نے اعتراض نہیں کیا مگر وہ دل میں ٹھان چکی تھی کہ وہ اس کے والدین

کو ضرور بلائے گی۔ اس دن وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مل کر ہنستے رہے اور

روتے رہے۔



اس کے بعد پیش آنے والے واقعات میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو قابل

ذکر ہوتی۔

شاہ نواز کی طبیعت بگڑتی چلی گئی وہ اس کے سر ہانے بیٹھی رہتی۔ اس کا ہاتھ

تھامے، روتی رہی، زیر ساری بھاگ دوڑ کرتا رہا، اماں جائے نماز سنبھالے رہیں۔ موہنی

اس کے والدین کو بلانا چاہتی تھی مگر شاہ نواز نے اپنے منہ سے ان کا اتنا پتا پھوٹ کر نہ

دیا۔ آخری دنوں میں اسے مسلسل درد منانے والے انجیکشن لگتے رہے اور اسے مسلسل

Sedation میں رکھا گیا۔

وہ دو دن سے مسلسل بے ہوش تھا۔ آخری بار ہوش آیا تو اس نے موہنی کا ہاتھ

چوما تھا اور دیر تک اسے دیکھتا رہا وہ بے حد کمزور ہو چکا تھا۔

20 فروری کا دن تھا۔ فحیر کے وقت اس نے بڑی خاموشی سے جان دے دی

تھی..... اس کی موت کے بعد.....

موہنی پر عجیب سی خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ روتی رہتی یا پھر

ڈھیر سارا دھواں دل میں جمع ہونے لگا، اس نے بمشکل آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔

”بہت برا کیا تم نے معاذ احمد! بہت برا سارے عالم میں میری ذات کا تماشا بنادیا،“ بھگی پلکوں کو رگڑتے ہوئے وہ جائے نماز پر کھڑی ہو گئی مگر یکسوئی کہاں تھی جیسے تیسے نماز ادا کرنے کے بعد اس نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے تو کتنے گرم آنسو چپ چاپ پلکوں کی باز توڑ کر بہتے چلے گئے، ساری دعائیں رستہ بھول گئیں۔

”اللہ! تو جانتا ہے یہ شخص میرے دل کا روگ بن گیا ہے، یہ مجھے جینے دے گا نہ مرنے، تو جانتا ہے میرے دل کا حال، صرف تو سمجھ سکتا ہے میں اسے کیسے مانگوں تجھ سے؟ کیونکر حاصل کروں اسے؟“ وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی، جب ماہم کا ہاتھ اس کے کندھے پر ٹھہر گیا۔

”کیوں روتی ہیں آپ! بس کیجیے خدا را سکون تو پہلے ہی لٹ گیا ہے، معاذ صاحب کی بدولت آپ تو یوں امتحان میں نہ ڈالیں“ وہ تلخی سے کہتی مڑ گئی، اسے کچھ اور شدت سے رونا آیا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ! سب ٹھیک ہو جائے گا“ فریخہ نے اسے تسلی دی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کچھ ٹھیک نہیں ہوگا فری! کچھ بھی نہیں“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ فریخہ نے نہایت دکھ سے اسے جاتے دیکھا، وہ صرف بڑی بہن نہیں تھی عزیز بہن بھی تھی اس کے دکھ پر دل تڑپ رہا تھا مگر کچھ کرنے سے قاصر تھی۔

آج صرف معاذ احمد کی بدولت ان کی فیملی ایک بندگی میں تھی جس کے آگے کوئی راستہ نہیں تھا اور واپسی ناممکن تھی، ورنہ آج سے چھ ماہ پہلے وہ بہت خوش رہتے تھے ہر حال میں شکر خدا کرتے قناعت پسند لوگ جنہیں خوش رہنے کے لیے ڈھیر ساری وجوہات کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں زندگی تلاش کرتے ہیں خوش ڈھونڈ لیتے ہیں اور اب؟ گلی بند تھی اور ایک بڑا سا سوالیہ نشان سب کے سامنے تھا،

دھند کے بعد

ایک خوش الحان آواز اس کی سماعتوں میں اتر رہی تھی، اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”ملیخ!“ بیٹے اٹھ جاؤ، نماز ادا کرلو!“ بابا جان کا مشفق چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے دوپٹہ درست کیا اور کبل ہٹاتی اٹھ گئی، وہ قرآن پاک لینے کے لیے اسٹڈی میں چلے گئے جب وہ واپس آئے تو صحن میں لگی ٹونٹی کے سامنے بیٹھی وہ کسی عیت سوچ میں منہمک نظر آرہی تھی، وہ حیران ہوئے۔

”ملیخ! کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں بابا! میں وضو کرنے لگی تھی“ اس نے کہتے ہوئے آستین فولد کرنا شروع کر دیں۔

”فریخہ اور ماہم کو بھی جگا دینا“ وہ ہدایت کرتے اپنے کمرے میں چلے گئے، اس نے وضو کرنے کے بعد تولیہ اٹھایا جب نظر اسٹڈی کے کھلے دروازے سے ہوتی دیوار پر ٹنگے کیلنڈر پر پڑی اس کا ہاتھ ایک لمحے کو وہیں قہم گیا۔

”یکم دسمبر“۔ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا، ملیجہ نے چائے کپوں میں ڈالی اور امی اور بابا جان کے کمرے کی طرف چل دی۔

”چائے لے لیں امی جان“ اس نے سر جھکائے تسبیح میں مشغول ماں کو پکارا، انہوں نے خاموشی سے کپ تھام لیا، بابا جان نے قرآن پاک پڑھنے کے بعد جزدان میں لپیٹ کر اسے دیا، اس نے تھام کر سینے سے لگا لیا اور خاموشی سے واپسی کے لیے مڑ گئی، وہ سب ایسے تو نہیں تھے جیسے اب ہو گئے تھے، ایک دوسرے سے نظریں چراتے، پریشان حال، خاموش، ہر وقت گھر میں ایک وحشت ناک خاموشی چھائی رہتی، ملیجہ کا دل رونے لگا۔

”میرے اتنے پیاروں کو تم نے کیسے ایک دوسرے کی نظروں سے چور بنا دیا ہے معاذ احمد“ وہ آنسو پیتی کچن میں آگئی، اسے ہر طرف پھیلی خاموشی سے وحشت ہو رہی تھی، اسے چھ ماہ پہلے کا منظر یاد آیا، کیسے ہر وقت گھر میں فری اور عباس نے اودھم مچایا ہوتا تھا، وہ ایک دوسرے کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتے تھے یہ دوسری بات تھی کہ ہر دوسرے منٹ وہ جھگڑ رہے ہوتے تھے، ماہم بہت خاموش، موڈی اور کسی حد تک تلخ مزاج تھی بقول عباس ”معاذ بھائی کی چچی“ تھی۔

صبح کا آغاز ان کے گھر طوفان کی نوید لے کر آتا تھا، ہلچل، اودھم، شور شرابا سب سے زیادہ آفت عباس نے مچائی ہوتی تھی، عین وقت پر اس کی ہر چیز گم شد ہو جاتی اسے اپنی ہر چیز ادھر ادھر پھینکنے کی عادت تھی اور اگلی صبح اس کی تلاش میں پورا گھر تپاٹ کرنے کی بھی، اوپر والے پورشن میں چچا جان کی فیملی آباد تھی، جن کے چار ممبر تھے، چچا، چچی، معاذ، عباس تین کمروں میں سے ایک چچا اور چچی جان کا بیڈ روم تھا اور دوسرا معاذ اور عباس کا مشترکہ بیڈ روم جبکہ تیسرے کوڈرائنگ روم کی شکل دے دی گئی تھی، کچن موجود تو تھا لیکن استعمال نہ ہونے کے برابر تھا عباس کو لیٹ نائٹ پڑھنے کی عادت تھی اور معاذ کو مکمل اندھیرے میں سونے کی، اسی وجہ سے عباس نے خاموشی سے ایک دن یہ سوچ کر کہ بھائی تنگ پڑتا ہوگا اپنی کتابیں اور کمپیوٹر سسٹم سمیٹا اور ڈرائنگ روم کا ایک کونا

سنبھال لیا، وہ بی ایس سی کر رہا تھا، اس کے پڑھنے کا طریقہ بھی منفرد سا تھا، فلور کشنز پر اپنی کتابیں، نوٹس، جرنلز اور ڈھیروں لکھے ان لکھے کاغذات بکھرائے، موسم کی مناسبت کیمطابق مشروبات جیسے گرمیوں میں یوگو یا اسٹرابری شیک اور سردیوں میں کافی کا فلاسک رکھے رکھتا، اس کی نیند بھی بڑی کچی تھی جہاں نیند آئی وہیں پین بند کیا، ہر چیز بکھری چھوڑ کر مکمل لیٹا اور صوفے پر دراز ہو گئے، نورین چچی اسے جگانے آتیں تو چیزوں سے بچا کر اس تک پہنچنا دشوار ہو جاتا، ایک دن انہوں نے غلطی سے اس کی چیزیں سمیٹ دیں، رات وہ کوئی اسائنمنٹ بنا کے سویا تھا اور حسب معمول تمام پیپرز وہیں بکھرے ہوئے تھے جب اس نے عین وقت پر اسائنمنٹ ڈھونڈا تو تمام کاغذات کو کس اپ پایا، اس کا پارہ چڑ گیا پھر تو اس نے وہ ہنگامہ مچایا کہ الامان وہ الحفیظ، نورین چچی نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا، اسے جگانے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا اس کے بعد سے وہ الارم لگا کر سوتا تھا، صبح اٹھتے ہی پہلے بکھری چیزیں سمیٹتا پھر کوئی دوسرا کام، کالج کے لیے تیار ہوتے ہوئے سب سے زیادہ مسئلہ اسے موزوں کی گمشدگی کا بنتا، سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر چلانا اس کا روز کا معمول تھا اور اب ملیجہ نے خاموشی سے سیڑھیوں اترتے عباس کو دیکھا وہ ناشتہ کئے بغیر بائیک سٹارٹ کرنے لگا، ورنہ کچھ عرصہ پہلے ناشتے پر اس کی فرمائشیں اور ملیجہ کا جھنجھلانا مثلاً آج مجھے ٹرانزل کھانا ہے، آلو کا پراٹھا چاہیے، ملیجہ کو اسے ہزار منتوں کے بعد منا کر ناشتہ کھانا پڑتا، ناشتہ کرتے ہوئے فری سے نوک جھونک اس کا محبوب مشغلہ تھا اور اب بائیک سٹارٹ کرتے ہوئے اس کی پیٹ تھوڑی اٹھ گئی تھی ملیجہ نے دیکھا اس کے پیر موزوں کے بغیر تھے، اس نے جھٹکے سے رخ موڑ لیا، فرید چادر لے کر آگئی، وہ اور عباس اکٹھے کالج جایا کرتے تھے۔

”ناشتہ نہیں کرنا؟“ فرید نے حیرانی سے پوچھا

”نہیں۔“ اس نے سر جھائے ہوئے کہا اور بائیک دروازے سے باہر

نکال لی۔

ماہم بھی سکول جا چکی تھی، اس نے بابا جان اور چاچو کو ناشتہ دیا اور خود چائے کا

پانی دوبارہ سے رکھ دیا، معاذ کا ناشتہ وہ کیسے بھول سکتی تھی، اسے پتا تھا نو بجے وہ اٹھتا ہے، سب سے پہلے ایک طویل ہاتھ لیتا ہے پھر ڈریس سلیکٹ ہوتا ہے پھر ناشتہ اور پھر دس بجے کے قریب اسے بینک کے لیے نکلنا ہوتا تھا، سب سے آخر میں معاذ کو ناشتہ دینا ہوتا تھا اس لیے وہ تسلی سے اس کے لیے پراٹھا بناتی، آلیٹ بنانے کے بعد رات کا سالن گرم کرتی اور تازہ چائے بنانے کے بعد ٹرے تیار کرتی پھر دھیمے دھیمے سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اس کے کمرے میں چلی آتی، وہ عام طور پر ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا بال بنارہا ہوتا تھا، دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ نظر اٹھاتا اور دوسرے ہی لمحے پھر مصروف ہو جاتا اور وہ ایک انٹرویو کا دل تہہ بالا کر جاتی، وہ کہکشاؤں پر چلتی ٹرے لئے آگے آتی اور ٹیبل پر دھرنے کے بعد ایک حرفی جملہ بولتی۔

”ناشتہ“ پھر کمرے کے ساتھ مصروف ہو جاتی جب تک وہ ناشتہ کرتا وہ کمرہ سمیٹ چکی ہوتی، ہوتا ہی کتنا تھا ایک پراٹھے میں سے آدھا پلیٹ میں موجود ہوتا اسی تناسب سے آلیٹ بھی، البتہ چائے کا کپ خالی ہوتا تھا، وہ ناشتہ کرنے کے بعد فارغ ہوتا تو فائل کو راٹھاتا دروازے تک جاتا پھر رک کر ایک لفظی حرف اس کے لبوں سے ادا ہوا۔

”خدا حافظ“ اور ملیہ کو لگتا جیسے اس کی ساری تھکن اڑ چھو ہو گئی ہو۔

وہ وہیں بیٹھ جاتی، بچا ہوا ناشتہ کرتی اور پھر اوپر والے پورشن کی صفائی ستھرائی میں مگن ہو جاتی، وہاں سے فارغ ہونے کے بعد نچلے پورشن میں مصروف ہو جاتی تب تک امی جان اور نورین چچی دو پہر کے کھانے کے لیے سبزی بنانا شروع کر دیتیں اور اب اس نے بے حسی سے کھولتے پانی کو دیکھا اور برز آف کرنے کے بعد کمرے میں آ گئی، کمرے میں ہر طرف فری اور ماہم کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں، اس نے ہر چیز ویسی ہی رہنے دی اور خود کمبل تان کر دراز ہو گئی، اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا، وہ اس وقت کچھ بھی سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھی وہ صرف گہری نیند سونا چاہتی تھی اور حیرت انگیز طور پر اسے نیند آ بھی گئی، کچھ دیر بعد وہ گہری نیند میں گم ہو چکی تھی، دوبارہ جب

اس کی آنکھ کھلی تو نظر سامنے لگے سفید وال کلاک پر گئی۔
”پونے چار“ وہ جھٹکے سے اٹھی، سامنے ہی ماہم کتابیں اور کاپیاں بکھراے، میتھس کر رہی تھی، کیلکولیٹر اس کے ہاتھ میں تھا۔

”گڈ آفٹرنون آپ!“ ماہم نے اس اٹھتے دیکھ کر کہا۔
”فری کہاں ہے؟“ اس نے سوئے سوئے لہجے میں سوال کیا۔
ماہم ایک بار پھر مصروف ہو گئی۔
”کھانا کس نے بنایا؟“ اس نے اگلے سوال کیا۔

”امی جان نے“

”اچھا“ وہ کہتی ہوئی اٹھ گئی، ہر چیز ٹھکانے پر تھی یقیناً فری نے آکر سب کیا تھا، اسے چمکتا گھر پہچنتا دئے کے شکار کر گیا کیونکہ جانتی تھی یقیناً فری تھکی ہوئی ہوگی اور تھکان کے باوجود یہ سب کام کرتے اسے کتنی کوفت ہوئی ہوگی، وہ باہر آئی تو فری آئینے کے آگے بال سلجھاتی نظر آئی، وہ ملیہ کو دیکھ کر مسکرائی۔

”فری! سوری، مگر آج میرا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا“ وہ افسوس سے بولی۔

”اٹس اوکے آپ! روز آپ ہی تو کرتی ہیں“ وہ بالوں کو کچر لگا کر بولی۔

”اب جائیں کھانا کھالیں اور اس گدھے کو بھی کھلائی، اتنا منہ پھولا ہوا ہے اس کا“ فری نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بتایا، پھر مسکرائی اس کا اشارہ یقیناً عباس کی طرف تھا، ملیہ کچن کی طرف مڑ گئی، کچھ دیر بعد وہ ٹرے تیار کر کے اوپر چلی آئی، وہ صوفے پر اونڈھا لیٹا ہوا تھا۔

”عباس! کھانا کھاؤ“

”مجھے بھوک نہیں“

”پاگل مت بنو کھانے سے کیا ناراضگی؟“

”میں تو خود سے ناراض ہوں“

جادو کی چھڑی گما دی تھی، اس نے معاذ احمد کو سرتا پادل دیا تھا، یوں تو معاذ احمد بڑا کم گو اور موڈی تھا، کم بولنا اور کم ہنستا شاید اس کی زندگی کے منشور میں شامل تھا، عباس کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے اپنے بھائی سے ضرورت سے زیادہ بات چیت کی ہو، فاریہ نے آتے ہی فوکس کیا تھا کہ اس گھر میں دونوں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

معاذ احمد، ملیہ احمد، سب سے زیادہ اہمیت معاذ کی تھی، اگرچہ فاریہ نے کبھی اسے باقی سب کے ساتھ بیٹھ کر ہنستے بولتے نہیں دیکھا تھا مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ارد گرد رہنے والوں کی دل میں پیوست ہوتے ہیں، ہر شخص ان سے پیار کرتا ہے، بغیر کسی وجہ کے دوسرے نمبر پر ملیہ تھی اور فاریہ کو لگا اس کا نام ملیہ کی بجائے ”مدریسا“ ہونا چاہیے تھا، اسے اپنے گھر سے متعلق ہر فرد کی فکر ہوتی تھی، صبح سے لے کر شام تک۔ فاریہ نے اسے کسی مشین کی طرح مصروف دیکھا۔

اگرچہ فاریہ کے سامنے ملیہ کی شخصیت بہت دبی ہوئی لگتی تھی مگر اسے کبھی اپنا خیال رکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا، اس کے نزدیک محبت صرف یہ تھی کہ اپنوں کا خیال رکھنا، ان کی پسند ناپسند یاد رکھنا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا دھیان رکھنا ہی محبت تھی، فاریہ نے اسے بے تحاشا مصروف دیکھا تھا۔

اسے چند دن پوزیشن لینے میں لگے اور پھر اس نے اپنی ساری توجہ معاذ احمد کی طرف مرکوز کر دی تھی اور پھر تو گویا معجزہ ہو گیا، وہ معاذ احمد جس کے پاس وقت کی بے تحاشا کمی تھی ہر وقت فاریہ کو کہنی دینے کے لیے تیار رہتا، پکنک اسپاٹس وزٹ کئے جاتے جن میں کے ایف سی تو کبھی جوئے لینڈ کبھی میکڈونلڈ تو کبھی فورٹریس شامل ہوتا، ملیہ کو ہمیشہ سے باہر گھومنے پھرنے سے الرجی تھی اس لیے وہ معذرت کر لیتی اور یوں فاریہ کو خود بخود اپنی اہمیت بنانے کا موقع مل گیا، وہ بات بات پر بلند قہقہے لگانے والی ایک بے حد باتونی اور بولڈ لڑکی تھی جو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ہنر بخوبی جانتی تھی، اس سے معاذ کی دن بدن بڑھتی انڈر سٹینڈنگ سب کی نظروں میں کھٹکنے لگی، سب کو لگنے لگا کہ شاید وہ اس میں انوالو ہو رہا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت خود فاریہ تھی جس

”کس بات پر؟“ ملیہ نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا، وہ اٹھ بیٹھا، خفا خفا سا۔
 ”آپی! آپ کو کوئی فکر نہیں؟“
 ”کس بات کی؟“

”اگلے اتوار کو یعنی کہ نو دسمبر کو محترمہ ملیہ کی یعنی آپ کی محترم معاذ احمد کے ساتھ رخصتی ہے۔“ وہ پھٹ پڑا۔

”تو کیا کرو؟“ وہ سکون سے بولی۔

”مجھے بھائی کی خاموشی سے ڈر لگ رہا ہے، ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ہے“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”فکر مندی چھوڑ دو عباس! میں کل بھی ان کی منکوحہ تھی آج بھی ہوں، میرا کھونا مضبوط ہے اور معاذ کے لیے اس کے سوا کیا کہوں“

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا

بس یہی بات اچھی ہے میرے ہر جانی کی

”یہ مت بھولیں کہ شادی خانہ آبادی پر فاریہ صاحبہ بھی آرہی ہیں“ اس نے یاد دلایا، وہ زخمی ہنسی ہنس دی۔

”میں اس کیسے بھول سکتی ہوں؟“

”آپ کو اس سے خطرہ محسوس نہیں ہو رہا؟“ وہ سخت حیران ہوا۔

”کیسا خطرہ؟ میں ایک خاموش تماشائی ہوں عباس! جو صرف تماشا دیکھتا ہے، اس سے اس کی رائے کوئی نہیں لیتا اور تمہارے بھائی صاحب زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں، یہی نا کہ عین رخصتی کے وقت انکار کر دیں تو میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں“ وہ خود اذیتی سے بولی، وہ اس کی انتہا پسندی پر دنگ رہ گیا۔

☆☆☆

اسے وہ دن آج بھی یاد تھا جب ”فاریہ“ نامی آفت کا نزول ان کے گھر ہوا تھا وہ بے حد خوبصورت اور ماڈرن تھی، رشتے میں ان کی پھپھوز اوتھی، اس نے آتے ہی گویا

کی ہر بات معاذ سے شروع ہو کر معاذ پر ہی ختم ہو جاتی۔

یہ صورتحال سب کے لیے نہایت تکلیف دہ تھی، گھر میں معاذ اور ملیجہ کی رخصتی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور اس پر یہ نیا تماشا کسی کے لیے بھی قابل قبول نہ تھا، گھر یلو ماحول بڑا عجیب سا ہو رہا تھا ہر فرد کھینچا کھینچا سا رہتا ایسے میں فاریہ کے قہقہے اور بھی اذیت ناک لگتے۔

ایک رات ملیجہ اور فاریہ کچن میں چائے پی رہی تھیں سب کمروں میں چائے تھے، معاذ بھی ابھی تک نہ آیا تھا، ملیجہ تو اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی جبکہ دوسری طرف فاریہ بھی اسی کے انتظار میں جاگ رہی تھی، اسی اثناء میں ڈور بیل ہوئی، ملیجہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا جبکہ فاریہ کچن کے دروازے کے پاس رک گئی، وہ بائیک اندر لے آیا، صحن میں لگے انرجی سیور کی روشنی میں معاذ کے ماتھے پر بندھی پٹی نمایاں تھی، ملیجہ کی چیخ نکل گئی۔

”یہ..... کیا..... یہ کیا..... ہوا ہے؟“ وہ ان سنی کر کے بائیک سٹینڈ پر لگانے لگا۔

”چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا“

”چھوٹا..... سا..... ایکسیڈنٹ.....؟“ وہ بدقت بولی، کئی آنسو گالوں پر

لڑھک آئے تھے، معاذ نے اس کے شانے کو تھپتھپایا۔

”ملیجہ! میں ٹھیک ہوں، کچھ نہیں ہوا مجھے“ وہ بے اختیار اس کے شانے سے

لگ گئی۔

”بالکل ٹھیک نہیں آپ، کوئی خیال نہیں اپنا“ وہ سسکنے لگی، معاذ نے اس کے

گرد بازو پھیل کر اسے تسلی دی، کچھ دیر بعد وہ اس کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی جب فاریہ نے اسے پکارا۔

”لاؤ ملیجہ! یہ میں لے جاتی ہوں ملیجہ نے قدرے چونک کر اسے دیکھا، اس

کے لہجے میں محسوس کن تبدیلی تھی، فاریہ دودھ لے کر اوپر چلی گئی، دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ پلٹا اور فاریہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا وہ اس وقت اس کی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

”یہ..... دودھ“ اس نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھایا، معاذ نے گلاس

تھام لیا۔

”تمہاری کزن تو بہت بولڈ ہے معاذ“ اس کے لہجے میں تلخی کے ساتھ طنز کی

آمیزش تھی، وہ چونکا پھر بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

”تو.....؟“

”مگر تم تو مجھے ہر وقت اس کی مثالیں دیتے رہتے ہو“ وہ کھلکھلا کر ہنسا (اگر

ملیجہ اسے اس وقت دیکھ لیتی تو شاید بے ہوش ہو جاتی)

”وہ حق رکھتی ہے (Beacuse she is my wife)“ وہ دکشی سے

مسکرایا، فاریہ کو جھٹکا لگا۔

”کیا مطلب؟ یہ کیسا مذاق ہے؟“

”یہ مذاق نہیں، یہ سچ ہے“

”تم نے مجھے دھوکہ دیا؟“ وہ صدے سے چور آواز میں بولی تھی وہ الجھا۔

”کیسا دھوکہ؟“

”میں یہ سمجھتی رہی کہ تم میرے ساتھ.....؟“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”تم پاگل ہو فاریہ؟“ وہ چیخ پڑا۔

”میرے کس انداز سے لگا تمہیں؟ ملیجہ میری بیوی ہے میں تو صرف اس لیے

یہ سب کرتا رہا کہ کہیں تم یہ نہ سوچو کہ اتنی دور سے آئی کزن کو کسی نے کمپنی نہیں دی،

صرف مروت کی وجہ سے اور تم؟ اتنا غلط سمجھا مجھے، مجھے ایک غیر فطری تعلق کس طرح

گوارا ہو سکتا ہے“ وہ حقارت سے بولا۔

”مگر مجھے یہی لگا، تمہارے انداز.....؟“ معاذ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”یو جسٹ شٹ اپ، میں نے تم سے کسی قسم کے عہد و پیمان نہیں کئے اور

میرے کس انداز سے لگا تمہیں کہ میں.....؟ تمہیں یہاں سے بڑے ہونے کی ضرورت

ہے فاریہ علی!“ اس نے اس کے دماغ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ خوش بھی دکھائی دے رہے ہیں، ابھی تو سب کزنز کے زرخے میں ہیں، تھوڑے انتظار کے بعد آجائیں گے، آپ ایزی ہو کر بیٹھیں، وہ تسلی دلا سادے کر چلی گئی اور اب ملیجہ تھی اور اس کی لالیعنی سوچیں۔

”کاش کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کتنی اذیت میں ہوں، کتنا تکلیف دہ ہے یہ احساس کہ کوئی ہماری پوری زندگی ہو اور ہم اس کی زندگی میں کہیں بھی نہ ہوں کاش معاذ! آپ کو یوں جبری طور پر خوش نہ ہونا پڑتا، میں جانتی ہوں میں آپ کے لیے مجبوری کا سودا ہوں، گلے پڑا وہ ڈھول جسے آپ کو ہر صورت بجانا پڑے گا“ وہ سوچ رہی تھی اور پاگل ہو رہی تھی جانے کب تک سوچتی رہتی اگر نیند اسے نہ جکڑ لیتی، دوسری طرف وہ ایسا پھنسا تھا کہ نکلنے کے چانس ہی نہ تھا۔

”دیکھو معاذ! آج تو دوستوں کا دن ہے“ آصف نے کمینگی کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل..... کیوں نہیں“ وہ بے چینی اندر دبا کر مسکرایا، وہ اسے بالکل معاف کرنے پر تیار نہ تھے کیونکہ بقول ان کے ”اتنا گھنا خاموش اور خاندان کا ہیرو پہلی بار ان کے ہتھے چڑھا تھا تو کیوں نہ گن گن کر بد لے لئے جائیں“

معاذ نے دزدیدہ نظروں سے وال کلاک دیکھا سوئی ایک کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔

”چلو ابھی کوئی گانا وانا سناؤ“ آصف نے ارباز کو اشارہ کیا اور وہ فوراً شروع ہو گیا۔

سونیے جے تیرے نال دغا مین کماواں

تے رب کرے میں مرجاواں

اسی وقت تایا جان چلے آئے، ارباز کا منہ فوراً بند ہو گیا۔

”بھئی بچو! رات کافی ہو گئی ہے، سونے کا ارادہ نہیں؟ ان کے لہجے میں ایک

خاص تحکم تھا، سب کھسک لئے، معاذ نے دل ہی دل میں نعرہ مارا۔

اس نے قطعیت سے بولتے ہوئے اسے باہر کا راستہ دکھایا۔

”یوے گو You may go“ وہ سرخ چہرے کے ساتھ باہر نکل گئی،

اگلے دن وہ واپس چلی گئی اس کے جانے کے ساتھ ہی خوشی اور شور شرابا بھی ختم ہو گیا ہر فرد دوسرے سے نظروں چراتا نظر آتا، معاذ پہلے کی نسبت زیادہ خاموش ہو گیا تھا اس کی خاموشی کی وجہ فاریہ کی روانگی کو محمول کیا گیا، سب کو عجیب سے وہم ستانے لگے اور انہیں دنوں رخصتی کی ڈیٹ طے کر دی گئی، اس سارے قصے میں اگر کوئی سب سے مظلوم ہستی تھی وہ یقیناً ملیجہ تھی جو کہ ایک عالم برزخ میں تھی، معاذ احمد سے اس کی محبت غیر مشروط تھی اگرچہ ان کے نکاح کو چار سال بیت چکے تھے مگر وہ جب چاہتی بے دھڑک اس کے کمرے میں چلی جاتی اسے کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ معاذ کے ساتھ تنہا ہے البتہ اس دن وہ اپنی بے اختیاری پر جی بھر کے شرمندہ تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ اس رات معاذ اور فاریہ کے درمیان ایسی کون سی بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اگلے دن ہی واپسی چلی گئی، اسے مکمل یقین تھا کہ معاذ، فاریہ کے ساتھ انوالو ہے لیکن چونکہ وہ بغاوت کی جرات نہیں رکھتا اس لیے مجبوراً اسے اپنا رہا ہے، وہ اس سوچ پر اتنی پر یقین تھی کہ یہ خیال اسے مار ڈالنے کے لیے کافی تھا کہ وہ معاذ کے لیے ناپسندیدہ ہے۔

☆☆☆

انہی روتے دھوتے اور بیزار کن دنوں میں شادی کا دن آپہنچا، وہ دلہن بن کر غضب ڈھا رہی تھی تو معاذ احمد بھی سیاہ ڈز سوٹ میں بے حد ہینڈ سم لگ رہا تھا، ایک طویل اور تھکا دینے والے دن کے اختتام پر اور ڈھیروں ڈھیر رسموں کے بعد وہ بے حد خوبصورتی سے سجے معاذ احمد کے کمرے میں موجود تھی۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ فاریہ شادی پر نہیں آئی تھی، وہ جانے کب تک سوچوں کے لامتناہی جنگل میں چک پھیریاں کھاتی رہتی جب ماہم نے اسے اس کے خیالوں سے نکالا۔

”آپی! آپ بالکل پریشان مت ہوں، معاذ بھائی کا موڈ بے حد اچھا ہے اور

”جنیں تایا جان“ وہ آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، بیڈ پر وہ بڑے سکون سے محو استراحت تھی، وہ چند لمحے کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر اس کے نزدیک بیٹھ گیا، اس کا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے چوڑیاں بجانیں اس کی آنکھیں فوراً کھل گئیں۔ اسے جاگتے پا کر وہ ہلکے سے مسکرایا۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو“ وہ کہیوں کے بل اٹھ گئی، معاذ کی تمام توجہ اس کی طرف تھی اور ملیحہ.....! اس کی تمام جان معاذ کے ہاتھ میں دبے ہاتھ میں سمٹ آئی تھی، اچانک بجلی کڑکی اور اس کے ساتھ ہی ٹائپ بارش برسنے لگی، ایک بارش باہر برس رہی تھی ٹھنڈی، سرد اور بے رحم اور ایک اندر برس رہی تھی، مہربان نرم اور پر حدت۔

”اگر..... یہ خواب..... ہے..... تو کاش..... میں..... کبھی نہ جاگوں۔“ ملیحہ نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔

☆☆☆

اگلی صبح کا رنگ بے حد خوبصورت اور دل فریب تھا، معاذ ابھی تک سو رہا تھا ملیحہ نے نظریں اس پر جمادیں، پھر اس کے لبوں پر ایک تکلیف دہ مسکراہٹ آگئی۔

”مروت نبھانا تو کوئی آپ سے سیکھے معاذ، بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے آپ نے اس جبر کی تعلق کو“ وہ بے حد قوطی ہو رہی تھی، اسی وقت دروازہ بجنے لگا ملیحہ نے ایک نظر سوئے ہوئے معاذ کو دیکھا اور پھر اٹھ کر دروازہ کھول دیا، کھلے دروازے سے ایک جم غفیر اندر آ گیا۔

ہر کوئی اپنی اپنی بولی بولنے لگا، آوازیں، قہقہے نت نئی بولیاں، یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ سویا رہتا، اس کے اٹھتے ہی سب اسے گھیر کر بیٹھ گئے پھر تو وہ ہنگامہ چاکہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

ولیمہ کی تقریب چونکہ شام کو تھی اس لیے سب ریلیکس تھے ولیمہ کی تقریب بخیر و بخوبی نپٹ گئی اور اس کے بعد ایک روٹین لائف شروع ہو گئی، فری کو میک اپ میں مہارت حاصل تھی وہ اسے روز تیار کر دیتی اور عباس واپسی پر گجرے لے آتا، یوں معاذ

کے آنے تک وہ بے حد خوبصورتی سے تیار شدہ اسے ملتی، اس روز بھی وہ لوٹا تو کمرے کے دروازے پر فری اور عباس دربانوں کی طرح تعینات نظر آئے۔

”خیریت؟“ وہ حیران ہوا۔

”جی بالکل“ عباس نے مسکرا کر کہا

”تو پھریوں کھڑے ہونے کا مقصد؟“ وہ الجھا۔

”ہمیں نیک چاہیے“ فری چمک کر بولی۔

”خدا کو مانو لڑکی یہ کون سی قسط ہے؟“ وہ بدکا۔

”میں آپ کی بیگم کو روز اتنا زبردست میک اپ کرتی ہوں۔“

”اور میں آپ کی بیگم کو روز گجرے لا کر دیتا ہوں اس کا“

”اچھا تو وہ تم دونوں کرتے ہیں“

”تو آپ کو کیا لگا ہمارے پچھواڑے کیا گجر کا پودا آگ آیا ہے؟“ عباس چمک

کر بولا۔

”یا پھر آپ کی بیگم اتنی زبردست بیوٹیشن ہیں؟“ فری نے فوراً تائید کی، وہ

بے بس ہوا۔

”چلو، ملیحہ سے پوچھ لیتے ہیں“ وہ انہیں لئے اندر آ گیا، ملیحہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی

تھی رائل بلیو کا مڈرسوٹ میں نفاست سے ہوئے میک اپ میں وہ بلاشبہ بے حد حسین

لگ رہی تھی۔

”ہاں بھئی یہ کیا کہہ رہے ہو تم“ وہ ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتا بولا۔

”ہمیں نیک چاہیے“ وہ دونوں کورس میں بولے، ملیحہ سمجھ گئی۔

”نیک چاہیے یا خدمات کا معاوضہ؟“

”جو آپ سمجھ لیں“ عباس ڈھٹائی سے بولا۔

”لیں بھی بیگم صاحبہ! انہیں تو فارغ کریں“ معاذ نے والٹ نکال کر اس کی

طرف بڑھایا، وہ شش و پنج کا شکار ہو گئی۔

”ملیحہ! ایک چھٹی کا دن ہوتا ہے اور تمہارے کام ہی نہیں ختم ہو رہے؟“

”نہیں کام تو کوئی نہیں ہے“

”چلو تیار ہو جاؤ کہیں گھومنے چلتے ہیں“

”شام تو ہو گئی ہے رہنے دیں“

”تو اچھا ہے ناشام ہو گئی ہے، فورٹریس چلیں گے یا پھر جوئے لینڈ اور واپسی پر کے ایف سی“ اس نے اصرار کیا تو وہ بھی ہار مان کر اٹھ گئی وہ اس کے جانے کے بعد سر ہاتھوں پر گرا کر بیٹھ گیا۔

”کیسی لڑکی ہے میرے مولا! کسی طرح بھی خوش نہیں ہوتی، جتنا بھی پیار کروں، کتنا بھی خوش رکھنے کی کوشش کراؤں، کوئی اثر ہی نہیں، ہر وقت بھی بھجھی سی رہتی ہے بات کیا ہے؟“ وہ سوچتے ہوئے الجھ رہا تھا جب کچھ سمجھ نہ آیا تو خود بھی اٹھ کر تیار ہونے چل دیا، وہ شاور لے کر لوٹا تو ڈرائنگ روم کا دروازہ بند نظر آیا، یعنی عباس آچکا تھا، وہ اسے بھی کہنے کے خیال آگے بڑھا، جب ملیحہ کی آواز نے قدم وہیں روک دیئے تھے۔

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا عباس میں کیا کروں؟“ وہ رندھی آواز میں بولی تھی۔

”معاذ بھائی تو بہت خوش ہیں آپ! اب آپ کو کیا پریشانی ہے؟“ عباس کی الجھی آواز اس کے کانوں سے نکلرائی۔

”وہ خوش نہیں ہیں، وہ بالکل خوش نہیں ہیں، وہ صرف مجبور ہیں، میں جانتی ہوں وہ فارسیہ کو پسند کرتے تھے وہ رونے لگی۔“

”چہ..... رو کیوں رہی ہیں اور فارسیہ تو ماضی کا قصہ بن چکی ہے بھول جائیں اسے۔“

”میں چاہوں بھی تو نہیں بھول سکتی کیونکہ میں جانتی ہوں وہ ان کے دل میں ہے۔“

”پاگل ہو گئی ہیں آپ کیا بھائی نے آپ سے کوئی بات کی؟“ وہ جھلا گیا۔

”یہ تو حال ہے بچاری عورتوں کا اگر کبھی شوہر مہربان ہو جائیں تو انہیں یقین نہیں آتا“ فری نے اس کی حیرت دیکھ کر مذاق اڑایا، وہ خفیف ہو گئی۔

”ایسی کوئی بات نہیں“ اس نے کہتے ہوئے والٹ کھولا اور انہیں پیسے دیئے لگی۔

”جیو پیاری بھابھی! خدا تمہیں خوش رکھے، سکھی رکھے، سدا سہاگن رہو، خدا تمہاری گود ہری.....“ عباس کسی ٹیپ ریکارڈ کی طرح جتنا رہتا اگر فری بروقت اسے کہنی نہ مارتی۔

”کیا ہے؟ بلبل اٹھا۔“

”کیا ایکسپریٹ فقیر کی طرح شروع ہو گئے ہو چلو اب“ فری نے اسے باہر دھکیلا، ان کے جانے کے بعد معاذ اس کے سامنے آ بیٹھا۔

”ملیحہ! تمہیں تو پتا ہے ناڈ ایلاگز کے معاملے میں بالکل اناڑی ہوں، شاعری بھی نہیں کر سکتا، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تم بہت پیاری لگ رہی ہو“ وہ دھیسے لہجے میں بولتا اسے اذیت میں مبتلا کر گیا۔

”اے ادھر تو دیکھو“ اس نے مسکرا کر ملیحہ کا چہرہ اپنی طرف پھیرا۔

”اور یہ کہ محبت کی اپنی زبان ہوتی ہے تمہیں یہ زبان سمجھ آتی ہے نا؟“ وہ اس کے رخسار پر ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا، ملیحہ کا دل خون ہونے لگا۔

”میں چائے لے کر آتی ہوں“ اس کا ہاتھ ہٹاتی اٹھ گئی وہ حیران سا وہیں بیٹھا رہ گیا۔

☆☆☆

وہ روزمرہ کے کاموں میں مشغول تھی، آج چھٹی کا دن تھا، معاذ گھر پر ہی تھا جبکہ عباس دوستوں کے ساتھ کہیں نکلا ہوا تھا، ملیحہ نے چائے کا کپ اس کے نزدیک رکھا اور واپس جانے لگی جب معاذ نے اس کا ہاتھ تھام کر روکا۔

”بیٹھو“ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں انہوں نے نہیں کی؟“ وہ اس کی بات کاٹ گیا۔

”کیا وہ آپ کا خیال نہیں رکھتے؟“ وہ مضطرب ہوا۔

”رکھتے ہیں اور یہی چیز تو مجھے زیادہ پریشان کرتی ہے کہ وہ خود پر جبر کر رہے ہیں، یہ خیال مجھے پل پل مار رہا ہے کہ میں ان کی پسند نہیں ہوں۔

”مجھے لگتا ہے آپ کو ایک بار بھائی سے بات کر لینی چاہئے؟“

معاذ کا دماغ جیسے خلا میں معلق ہو چکا تھا، اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی، وہ تیزی سے پلٹا اور اپنے کمرے میں آ گیا، وہ ستائیس دسمبر کی بے حد تنگ اور سرد شام تھی مگر اسے لگا جیسے پورے وجود سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہوں، ایک گلاس پانی پینے کے بعد وہ بلند آواز میں چلایا۔

”ملیہ!“ چند سیکنڈز بعد وہ اندر آ گئی، جھکے سر کیساتھ وہ کیا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ جانتا تھا، چند لمحوں کے بعد وہ اسے تند و تیز نظروں سے گھورتا رہا پھر بے اختیار آگے بڑھا۔

”کیا لگتا ہے تمہیں؟“ اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ گاڑھے وہ دھیمے لہجے میں غرایا۔

”تمہیں لگتا ہے میں فاریہ کو پسند کرتا ہوں؟ تمہیں لگتا ہے میں مجبوراً تم سے نبھا رہا ہوں؟ تمہیں لگتا ہے وہ آج بھی میری زندگی میں ہے؟ تمہیں لگتا ہے میں خود پر جبر کر رہا ہوں؟ اور کیا کیا لگتا ہے تمہیں ایک ہی بار بتا دو؟“ اس کی حیرانی سے پھیلی کشادہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ کتنی اذیت میں تھا۔

”ایسا کیسے سوچ لیا تم نے؟ وہ بد تمیز اور بد تہذیب لڑکی جس کو دیکھنا تو دور جس کی میں بات کرنا پسند نہیں کرتا تم نے اسے میرے ساتھ.....؟ وہ صرف میری کزن تھی؟ میں نے تو کبھی تم پر ایک استحقاق کی نظر نہیں ڈالی تھی حالانکہ تم میری منکوحہ رہی ہو چار سال اور تم نے میرے بارے میں اتنا غلط سوچ لیا اتنا گرا ہوا سمجھ لیا مجھے؟“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا، ملیہ کو جھٹکے پر جھکا لگ رہا تھا۔

”میں تو ہمیشہ سے تم سے محبت کرتا ہوں ملیہ، ہاں اظہار اب کرتا ہوں اور پہلے کبھی نہیں کیا اور تمہیں لگتا ہے میں جبری طور پر یہ سب کرتا ہوں“

”معاذ! میری بات سنیں“ وہ بے قراری سے بولی، معاذ نے اس کے شانوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔

”کوئی بات نہیں سنی مجھے، دور ہو جاؤ میری نظروں سے“ وہ رخ موڑ گیا۔

”معاذ میں.....؟“ اس کے لب کچھ کہنے کی خواہش میں پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا، رات وہ بہت دیر سے گھر لوٹا تھا، ملیہ اس کا انتظار کرتے کرتے آخر کار نیند کی آغوش میں چلی گئی اور دوسری طرف وہ رات گئے ٹھنڈ میں پھرتا رہا جس کا نتیجہ اگلے دن سامنے آیا تھا، اسے تیز بخار نے آیا تھا، چچا جان نے اسے جاب پر نہیں جانے دیا تھا، ڈاکٹر چیک کرنے کے بعد دوائیاں لکھ کر دے گیا، ملیہ کچن میں سوپ تیار کر رہی تھی کچھ دیر بعد وہ سوپ کا باؤل تھامے کمرے میں آ گئی۔

یہ..... سوپ..... پی..... لیں“ وہ بہت ہمت کر کے بولی تھی۔

”رکھ دو کہیں اس آب حیات کو پی لوں گا“ وہ تنخی سے کہہ کر منہ لحاف میں چھپا گیا، ملیہ آنسو بیتی باہر آ گئی۔

”ملیہ معاذ نے دوالی؟“ چچی جان متفکر ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

”جی نہیں وہ سوپ ہی نہیں پی رہے۔“

”ہاں، بیماری میں بڑا چڑچڑا ہوا جاتا ہے، ہزار خروں کے بعد مانتا ہے“

”جی میں پھر کوشش کرتی ہوں“ وہ واپس کمرے میں پلٹ گئی۔

”معاذ! بس کر دیں، معاف کر دیں مجھے“ وہ روہانسی ہو کر کہہ رہی تھی۔

”اچھا سوپ تو لے لیں“ وہ خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گیا، سوپ پینے کے بعد اس نے دوائیاں لیں اور پھر سے بستر میں دبک کر غافل ہو گیا۔

اگلے دن اس کی طبیعت کافی بہتر تھی، اس نے پورا دن ملیہ سے کوئی بات نہیں کی تھی وہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ اٹھ کر چلا جاتا، اس سے اگلا دن بھی

اس طرح بیت گیا وہ کچن میں لُچ بنا رہی تھی جب عباس چلا آیا۔

”آپی! کھانے میں کتنی دیر ہے؟“

بس تیار ہے۔ وہ بھیگی آواز میں بولی۔

”کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان ہیں؟“

وہ ٹھٹھا کا تھا۔

”نہیں تو“ اس نے نظریں چرائیں۔

”مجھ سے چھپائیں گی؟“ بتائیں بات کیا ہے؟“ وہ برامان گیا۔

”وہ مجھ سے ناراض ہیں عباس اور وہ.....“ وہ اسے سب بتاتی چلی گئی، وہ

دنگ رہ گیا تھا۔

”کیا بات ہے آپ کی؟ بڑے بڑے معرکے مار لیے ہیں آپ نے تو کل ہم

نے آپ کے لیے سرپرائز پارٹی رکھی ہے نیو ایئر کی خوشی میں مجھے نہیں پتا منائیں اپنے

میاں صاحب کو، کل مجھے آپ کے یہ بگڑے ہوئے چہرے نظر نہ آئیں“ وہ وارنگ

دیتا چلا گیا۔

اور وہ بات کرنے کا موقع ڈھونڈتی رہ گئی موقع تو تب ملتا جب وہ اسے موقع

دیتا، اگلا دن بیت گیا، وہ صحن میں تھی جب عباس آیا۔

”میں بیکری پر جا رہا ہوں کیک لینے“

وہ اندر چلی آئی، معاذ بڑی تسلی سے بیڈ پر بیٹھا اپنے آگے کچھ پیپر رکھے لکھنے

میں مصروف تھا، وہ اس کے نزدیک آگئی۔

”معاذ..... میں.....“ اس نے بات شروع کی ہی تھی کہ وہ پیپر ایک طرف

پھینکتا اٹھا اور کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوا۔

ملیجہ کا دل بھرانے لگا اور وہ بھی اٹھی اور چلتی ہوئی اس کی پشت پر آکھڑی ہوئی

پھر اس نے سر اس کی پشت سے ٹکا دیا۔

”بس کریں ناراضگی، مجھ سے اور نہیں سہا جاتا، میں مانتی ہوں اپنی غلطی، اب

بس کر دیں، معاف کر دیں مجھے“ اس کے آنسو بہنے لگے، معاذ نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر

اسے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

”رو کیوں رہی ہو؟“ غصیلا لہجہ، مگر وہ ذرا بھی نہیں ڈری۔

”میں رو نہیں رہی، میں تو آنکھیں صاف کر رہی ہوں تاکہ آپ کو واضح طور پر

دیکھ سکوں آپ مجھے پھر کسی دھند میں لپٹے ہوئے نظر نہ آئیں“ وہ چند لمحوں سے دیکھتا رہا

پھر بے اختیار اسے سینے میں بھینچ لیا۔

”اگر پھر کچھ غلط سوچا تو.....؟“

”تو مجھے موت آ جائے“ وہ شدت پسندی سے بولی۔

”پاگل“

”نئے سال کا آغاز کیا روتے ہوئے کرو گی؟“ ملیجہ کے آنسو فوراً بند

ہوئے تھے۔

”مجھے ہمیشہ اسی طرح چاہیں گے معاذ!“ اس نے یقین دہانی کروانی چاہی۔

”ہاں، ہمیشہ اسی طرح چاہوں گا“ معاذ نے اس کی پیشانی کو چوما۔

”کبھی ناراض تو نہیں ہوں گے؟“

”نہیں“ اس نے اب کی بار اس کی ننھی سی ناک کو چھوا۔

”اور باہر جانے کے لیے بھی نہیں کہیں گے۔“

”کیوں بھی؟“ معاذ کو فوراً اعتراض ہوا۔

”مجھے جہوم سے وحشت ہوتی ہے“

”جیسی میری جان کی خوشی“ وہ مسکرایا، اسی وقت دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔

”بھائی! آپی! آجائیں“ عباس کی آواز تھی۔

”یہ کیوں ڈسٹرب کرنے آ گیا ہے؟“ وہ بد مزہ ہوا، وہ ہنستی ہوئی اس سے

اُٹھ ہو گئی۔

”نیو ایئر نائٹ ہے آج، پارٹی رکھی ہے انہوں نے“

زیست کا سفر

”ازلان میڈیکل کمپلیکس“ کی وسیع و عریض شاندار عمارت اس کی نظروں کے سامنے تھی، تیز سال کے طویل عرصے کے بعد وہ اپنے پیروں سے لپٹی بیڑیوں سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا، آج تیرہ سال بعد اس نے پاکستان قدم رکھا تھا

”اس واپسی کا مقصد؟“

”اس واپسی کا محرک“ اس نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے اپنے ساتھ کھڑی ہستی کو دیکھا، دل میں اس کے لیے موجود محبت کچھ اور بڑھی تھی، جنوں خیزی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا، عشق کچھ اور شدت اختیار کر گیا تھا۔

☆☆☆

”سام فوڈ کارنز“ سے اس نے اپنا پسندیدہ برگر خریدا اور کچھلی طرف بنے ہوئے ریسٹورنٹ کی عقبی سرڑھیوں میں بیٹھ گیا ایک بانٹ لیتے ہوئے اس نے کسی معمول کی طرح ارد گرد بنی عمارتوں، دکانوں اور ہوٹلز کو دیکھنا شروع کر دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان میں سے کوئی چیز بدلی نہیں اور نہ ہی ان میں سے کچھ دریافت ہو سکتا ہے، ابھی اس نے دو تین بانٹس ہی لی تھیں کہ اسے سسکیوں کی آواز آئی، ایک لمحے کو اس کا چلتا ہوا

”او..... اچھا..... تو نئے سال کے لیے آپ کی دعا کیا ہوگی بیگم صاحبہ“ وہ اس کا ہاتھ تھامے دروازے کی سمت بڑھتے سے پوچھ رہا تھا۔

”یہی کہ ہمیں ایک دوسرے کی محبت راس آجائے“ وہ باہر آگئے، ڈرائنگ روم کے سینٹرل ٹیبل پر بہت خوبصورتی سے لوازمات سیٹ کئے گئے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ ماہم چلائی۔

”فری تمہارے چیف گیسٹ اتنے خراب حلیوں میں آئے ہیں۔“

”چیف گیسٹ جو ہیں“ عباس مسکرا کر بولا، سب کھلکھلا دیئے۔

”چلیں جناب یکے کا ٹیس“ فری نے چھری معاذ کو تھمائی۔

معاذ نے چھری ملیجہ کے ہاتھ میں دی اور اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا، سب کی معنی خیز آوازوں اور سیٹیوں کے شور میں انہوں نے یکے کا ٹاٹھا، وہ دل سے اپنے رب کا شکر گزار ہو گئی، جس نے اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا تھا۔

آنے والے سال کا آغاز بے حد خوبصورتی سے ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ سال اس کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئے گا، اس نے مسکراتے ہوئے یکے کا ٹاٹھا

معاذ کے منہ پر مل دیا۔



منہ رک گیا، یکنخت حلق میں جیسے کڑواہٹ سی گھل گئی، دیکھے بنا بھی وہ جان سکتا تھا کہ آواز اس کی عقبی طرف سے آرہی تھی یقیناً وہ جو کوئی بھی تھی اس سے اوپری سرہی پر پہلے سے ہی موجود تھی، مگر اندھیرے کے باعث دیکھ نہ سکا تھا، شدید کوفت محسوس کرتے ہوئے اس نے برگر کو پیپر میں لپیٹا اور عادتاً اپنی بائیں جیب میں ٹھونس لیا، اسے آنسوؤں سے نفرت تھی ساری زندگی ان آنسوؤں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا، اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس نے روتے دھوتے گزارا تھا، کبھی کسی کے سر دروے پر کبھی کسی کی نفرت بھری نگاہ پر، کبھی کنیلے نوکیلے جملوں پر اس نے سوائے رونے کے کیا ہی کیا تھا مگر اب وہ بڑا ہو گیا ہے اسے نہ صرف آنسوؤں سے نفرت ہے بلکہ وہ کسی کو روتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا وہ وہاں سے اٹھ کر جانا چاہتا تھا مگر ایک آواز نے قدم وہیں باندھ لئے تھے۔

☆☆☆

اس نے نمبر کو ٹیکس میں سے نکالا اور ایک نظر احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے موبائل پر ڈالی۔

”کے فون کرنا ہے معاذ بھائی! لائیں میں ملاتی ہوں“ حرا نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

وہ اس وقت معاذ کی انگیجمنٹ سے فارغ ہونے کے بعد واپس گھر جارہے تھے، تقریب کا انعقاد چونکہ ہال میں تھا اس لیے سب اپنے اپنے ذرائع آمد و رفت سے اب واپس جارہے تھے ان کی گاڑی سے پیچھے سکندر کی گاڑی تھی، حرا نے نام پڑھ کر نمبر پیش کیا اور فون کان سے لگایا اور دوسری طرف سے آتی آواز کو سنا۔

”I am azlan please your message“ اس نے کچھ کہنے کے لیے معاذ کی طرف دیکھا مگر فرشتہ اجل نے موقع ہی نہ دیا سامنے سے آتا بے قابو ٹرالر ان کی منہ منی سی شیورلٹ سے ٹکرایا اور اس کی چینیں نکل گئیں، پھر اس کے بعد خاموشی چھا گئی شاید موت کی خاموشی۔

☆☆☆

سکندر حیات نے آپریشن تھیٹر سے باہر نکل کر ایک طویل افسردہ سانس لیا اور ہاتھوں سے گلوڑا اتارتے ہوئے چیئر پر گر گئے، باوجود انتہائی کوششوں کے وہ سوائے حرا کے کسی کو نہ بچا پائے تھے، اس خوفناک تصادم میں احتشام، صوفیہ احتشام اور معاذ احتشام تینوں ہی لقمہ اجل بن گئے، سکندر حیات گردیزی اس ہسپتال کے مالک تھے، چونکہ وہ خود ایک ڈاکٹر تھے اور حرا وغیرہ کی گاڑی کے پیچھے ان کی گاڑی تھی اس لیے وہ ان کو اسی ہسپتال میں لے آئے تھے، حرا خود پر ٹوٹنے والی قیامت سے بے خبر ان کے ہسپتال میں بے ہوش پڑی تھی، یہ جانے بنا کہ زندگی نے اس سے اس کے سارے رشتے چھین لیے ہیں۔

☆☆☆

وہ خاموشی سے ڈرائنگ روم میں بچھی چاندنیوں پر بیٹھی سپارہ پڑھ رہی تھی ہاں، وہ حرا احتشام تھی، بے پناہ مضبوط اور بلند حوصلہ رکھنے والی، آہنی چٹانوں جیسا عزم رکھنے والی حرا احتشام جو ماں باپ اور بھائی کو کھو چکی تھی، آج ان کی رسم قل تھی، جس میں کراچی سے اس کے دو ماموں اور ایک خالہ آئے تھے، نہایت احسان کرتے ہوئے۔

آخر کراچی سے لاہور کا فاصلہ بھی تو اتنا ہے تاکہ یہ احسان کیا جائے اور احسان مانا جائے اور رات میں وہ ناقابل حل بحث چھڑ گئی تھی جس سے سب ہی بچنا چاہ رہے تھے مگر اسے حل کئے بنا چارہ بھی تو نہ تھا۔

”دیکھو بھئی عظیم! تم جانتے ہو میری تو اپنی چار بیٹیاں ہیں میں ہرگز اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ حرا کا بوجھ اٹھا سکوں۔“ فہیم صاحب جو کہ سب سے بڑے تھے صاف انکار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے اسی وقت ثمنینہ بول اٹھیں۔

”آپ تو جانتے ہیں بھیا! کہ میں خود اپنے سسرال میں کیسے گزارہ کر رہی ہوں اور آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔“ انہوں نے زمانے بھر کی مسکیت چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا، اب باقی صرف عظیم ہی بچے تھے۔

”اور تم دونوں بھی جانتے ہو کہ میرے تین جوان بیٹے ہیں میں اس جوان

☆☆☆

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں مسلمان ہوں؟“ وہ حیران سا پوچھ رہا تھا۔

”میں تمہاری بات سن لوں گا، اگر تم یہ رونا بند کر دو تو“ وہ کوفت زدہ ہو کر بولا۔

”میرا نام آسیہ عبدالرحیم ہے، ایک بھائی اور بہن اور ہیں، بھائی نیویارک میں اور بہن ٹیکساس میں رہتی ہے، میری ماں مانچسٹر میں رہتی تھی“

”تم ہارورڈ کی ڈگری یافتہ ایک پبلک لائبریری میں کام کرتی ہو؟“ وہ پھر سے اس کی بات کاٹ گیا۔

”کیوں کہ یہاں میرے لیے کوئی نوکری نہیں ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”لیکن کیوں“

”ارے نہیں بھائی صاحب! یہ بھائی صاحب کی آخری خواہش تھی اور اسے پورا کرنا تو ہمارے اوپر فرض ہے،“ شمیمہ فوراً بول اٹھیں اور سب ہی تائید کرنے لگے تو سکندر ایک طویل سانس لیتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے، انہیں ابھی حرا احتشام کے

”وہ ایک سیاہ فام تھی“
 ”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟“ وہ پوچھنے لگی۔
 ”ازلان سکندر“

☆☆☆

وہ فون ہاتھ میں لیے ساکت سے بیٹھے تھے حسب معمول اس کا فون آنسرنگ مشین پر لگا تھا۔

”I m azlan please leave your message“ ان کی آنکھوں میں نمی آگئی اور حسب معمول انہوں نے کوئی بات کئے بغیر فون بند کر دیا۔

بھیڑ میں زمانے کی ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں
 معذرت کے لفظوں کو روشنی نہیں ملتی
 لذت پذیرائی پھر کبھی نہیں ملتی
 بے رخی کے گارے سے، بے دلی کی مٹی سے
 فاصلے کی اینٹوں سے اینٹ جڑنے لگتی ہے۔

ایک ذرا سی رنجش سے
 شک کی زرد بھٹی پر، پھول بدگمانی کے
 اس طرح سے کھلتے ہیں
 زندگی سے پیارے بھی، اجنبی سے لگتے ہیں
 عمر بھر کی چاہت کو آسرا نہیں ملتا
 دشت بے یقینی میں راستہ نہیں ملتا
 خاموشی کے وقفوں میں بات ٹوٹ جاتی ہے

اور سرا نہیں ملتا
 بھڑ میں زمانے کی
 ساتھ چھوٹ جاتے ہیں

”یہ آپ کو مجھ دیکھ کر پتا چل جائے گا“
 ”او کے آگے بولو“

”لابریری کا مالک جوزف ایک کرپچن ہے وہ مجھے دو ماہ سے شادی کے لیے تنگ کر رہا ہے اور مجھے میری تنخواہ بھی نہیں دے رہا، میری لینڈ لیڈی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے، کیوں کہ میں اسے کرایہ نہیں دے پا رہی“ وہ بات ختم کر کے پھر سے رونے لگی۔
 ”تم یہاں کب سے بیٹھی ہو؟ اور تمہارا سامان کدھر ہے؟“ وہ حیرت سے بولا۔
 ”تین گھنٹوں سے اور سامان تو صرف یہ ہے“ وہ اسے اوپر والی سیڑھی پر پڑا بیگ دکھاتے ہوئے بولی۔

”آپ میری مدد کریں گے نا“ وہ بہت آس سے پوچھ رہی تھی۔
 ”ہاں لیکن میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ طویل سانس لیتا پوچھنے لگا۔
 ”مجھے رہنے کے لیے کوئی کمرہ دلا دیں میں کسی کے ساتھ شیئر بھی کر لوں گی اور کوئی چھوٹی موٹی نوکری“ وہ کہنے لگی۔

”کمرہ تو میرا اپارٹمنٹ شیئر کرلو، میں اکیلا رہتا ہوں اور جہاں تک نوکری کا سوال ہے تو.....؟“ وہ سر پر ہاتھ مارتا کچھ سوچنے لگا۔

”آپ مجھے اپنے گھر نوکری دے دیں، میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں (Daily work) کے لیے ملازمائیں رکھی جاتی ہیں میں آپ کے سارے کام کروں گی، ڈش واشنگ، ڈسٹنگ اور میں کھانا بھی بہت اچھا بناتی ہوں۔“ وہ جوش سے بولنے لگی۔

”یہ ٹھیک ہے“ وہ مطمئن ہو کر بولا، پھر بے ساختہ پوچھ لیا۔
 ”اور پے کیا لوگی؟“

”جو بھی دے دیں“ وہ تشکر کے ساتھ بولی۔

”او کے چلو پھر“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔

آسیہ نے بھی بیگ گھسیٹا اور اٹھ گئی اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جب وہ روشنیوں میں آئے تو اس نے جانا کہ اس کے لیے نوکری کیوں نہیں۔

چھوڑ کر خود ہاسپٹل چلے گئے۔

ہاسپٹل میں ان کے کولیگ ڈاکٹر ایاز نے بڑے دھیان اور فکر مندی سے ان کا جائزہ لیا تھا۔

”تم اسے واپس بلا لو سکندر“ کوریڈور میں چلتے سے ڈاکٹر ایاز کی مدہم آواز انہیں شکد کر گئی۔

”تت..... تم؟“ وہ حیرت زدہ سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”تمہارا بیٹا ہے وہ سکندر، ایسی بھی کیا ناراضگی کہ اتنے سالوں بعد بھی وہ لوٹ نہ سکے تم اسے منالو“ وہ نارمل انداز میں کہہ رہے تھے، جبکہ حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنہلنے کے بعد ڈاکٹر سکندر نے مغموم نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”تم جانتے ہو ایاز وہ بھی میرا ہی بیٹا ہے، میری طرح ضدی اور ہٹ دھرم، وہ کبھی میری بات نہیں مانے گا“

”تمہارے پاس اب اتنی مہلت نہیں ہے سکندر کہ تم کسی معجزے کا انتظار کر سکو، دو ایک ہو چکے ہیں اور تیسرا جان لیوا ہی ہوتا ہے، اب کوئی ٹینشن اور کوئی بھی صدمہ اس تیسرے ایک کا سبب بن سکتا ہے“

”میں کیا کروں ایاز، وہ میری بات ہی نہیں سنتا“ وہ بے چارگی سے بولے۔

”تم کوشش کرو اسے منالو آخر یہ سب کچھ اسی کا تو ہے وہ تمہارا اکلوتا بیٹا ہے سکندر تمہاری اور شازمہ کی نشانی“ ڈاکٹر ایاز کا لہجہ تیز ہوا تھا۔

سکندر کے اندر چھن سے نجانے کتنا کچھ ٹوٹ گیا، یکدم یادوں کا ریلا آیا تھا۔

☆☆☆

آسیہ اس کے اپارٹمنٹ تک آتے آتے اس کو تقریباً اپنی ہر بات بتا چکی تھی، مکمل تفصیل کے ساتھ۔

”لوگ مجھے مسلم ماننے کو تیار نہیں ہوتے، بکو اس بات، بھئی کیا سیاہ فام مسلمان نہیں ہوتے؟ اور میں کلیئر کر دوں میں پیدائشی مسلمان ہوں، میری پوری فیملی مسلم

خواب ٹوٹ جاتے ہیں

پچھتاوے تھے کہ جسم کی رگ رگ سے جاں نچوڑنے کے درپے تھے وہ نم آنکھیں لیے اپنی عمر بھر کی پونجی کے لئے کا متاشا دیکھ رہے تھے، یہ کانٹوں کی فصل انہوں نے خود ہی تو بوی تھی، وہ کیسے توقع کر سکتے تھے گا بوں کی،، کانپتے ہاتھوں کے ساتھ انہوں نے فون بیڈ پر پھینک دیا اور یاد کرنے کی کوشش کی۔

کتنا چھوٹا تھا وہ جب ان سے دور تھا، کتنے سال ہو گئے اسے ان سے پچھڑے، کتنے سال؟ انہوں نے انگلیوں پر یاد کرنے کی کوشش کی۔

”ایک دو تین“ وہ رک گئے، انہیں جھٹکا سا لگا تھا۔

”گیارہ سال، گیارہ سال ہو گئے“ وہ بے یقینی سے اپنی انگلیوں پر پھر سے گنتے لگے۔

”گیارہ سال ہو گئے؟“ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ لگے۔

☆☆☆

اگلے دن ان کی آنکھیں سرخ اور طبیعت بو جھل سی تھی، ناشتے کی میز پر حرا انہیں دیکھ کر چونک گئی وہ اب یہاں پورے طور پر ایڈجسٹ کر چکی تھی، ویسے بھی وہ کم گو اور ریزروسی رہنے والی لڑکی تھی، جو عام طور پر کتابوں میں کھوئی نظر آتی اس نے سکندر کی ساری اسٹڈی چھان ماری تھی۔

اس کا ہاؤس جاب شارٹ ہو چکا تھا، یوں تو اسے سکا لرشپ بھی ملا تھا مگر سکندر نے اس کا سارا خرچا خود اٹھایا تھا اور سکا لرشپ بینک میں جمع کروا دیا تھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا اکل“ وہ پریشانی سے پوچھنے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹے، بس سر میں درد تھا تھوڑا، اب نہیں ہے آؤ ناشتہ کریں اور آج کمپیوٹر لینے بھی چلیں گے“ وہ بڑی خوبصورتی سے بات بدل گئے۔

وہ مطمئن ہوئی یا نہیں مگر ناشتے کی میز پر آ گئی، ناشتہ کرتے ہوئے وہ اس سے اس کی اسٹڈیز کے متعلق پوچھتے رہے اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، پھر اسے کالج

”کوئی مجھ سے شادی کرتا ہی نہیں“ مسکراتا لہجہ خود اپنا مذاق اڑاتا ہوا۔

”اور مجھ سے بھی کوئی شادی نہیں کرتی“

”لیکن.....؟“ آسیہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

”اگر تمہارا انٹرویو ختم ہو چکا ہو تو اندر چلیں“ وہ ترش لہجے میں بولا تو وہ ایک

دم سے ہوش میں آگئی، وہ کب سے گاڑی روک کر اس کے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا، وہ شرمندہ سی ہو گئی، خاموشی سے گاڑی سے اتر کر اس کیساتھ چل پڑی۔

وہ اندر داخل ہوئے ہر طرف چھائے اندھیرے کو دیکھتے ہوئے ازلان نے سوچ بورڈ پر ہاتھ مارا، ہر طرف روشنی کی کرنیں پھیل گئیں، ایک لمحے کو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، تیز اور چاروں طرف پھیلی ہوئی روشنیوں میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے، جو جھکا آسیہ کو دیکھ کر ازلان کو لگا تھا اب ایسا ہی ایک جھکا آسیہ کو لگا، کم روشنی اور اپنی لاپرواہی کے باعث اس نے ازلان کو اب تک اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا مگر اب روشنی میں اس کا چہرہ اور خدو خال بے حد نمایاں ہو رہے تھے۔

وہ ایک دراز قامت، گندمی رنگت اور بے حد سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والا ایک دلکش اور خوبصورت آدمی تھا اگر جو اس کے چہرے پر.....؟

اس کی سوچ کا ربط ٹوٹ گیا، وہ اس کے یوں دیکھنے پر ذرا بھی نہیں چونکا تھا۔

”آؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھاؤں“ سپاٹ لہجے میں بولا وہ پلٹ گیا۔

”ازلان یہ (پچکی ہٹ) یہ آپ کے رخسار پر.....“ وہ جھجک کی وجہ سے بات مکمل نہیں کر سکی۔

”پیدائشی ہے“ اس نے مڑے بغیر جواب دیا اب وہ کمرے کا دروازہ کھول

رہا تھا۔

”اس کی ڈسٹنگ وغیرہ ہونے والی ہے وہ تم خود دیکھ لینا اور وہ رہا کچن کچھ

کھانے کا موڈ ہو تو.....“ وہ بات ختم کر کے ساتھ والے کمرے میں گھس گیا، جبکہ وہ

ساکت کھڑی اس کے رویے اور لہجے پر غور کر رہی تھی اور شاید اس کے چہرے پر بھی۔

ہے اور وہ ایڈیٹ جوزف مجھے کہتا تھا کہ کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ کچن ہے اور میں مسلم، حد ہے کتنی غلط بات ہے نا یہ؟“ اس نے ایک لمحے کو رک کر ازلان کے تاثرات کا جائزہ لیا، وہ نہایت سرد تاثرات کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

”آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ آپ کیا کرتے ہیں؟“

”میں ڈاکٹر ہوں“ وہ مختصر بولا۔

”کس چیز کے؟“ برقی رفتاری سے سوال آیا۔

”ہارٹ سرجن“

”کب سے لندن میں؟“ اگلا سوال۔

”گیارہ سالوں سے“

”ج! اس کا مطلب آپ کی ایجوکیشن یہیں سے کمپلیٹ ہوئی ہے“ حیرت

زدہ انداز تھا۔

”ہوں“ جواب مختصر تھا۔

”آپ اکیلے کیوں رہتے ہیں؟“

”کیوں کہ میں اکیلا ہی ہوں“

”آپ کے گھر والے؟ آئی مین پیرنٹس بہن بھائی وغیرہ؟“

”میں اکلوتا ہوں“

”اور والدین؟“ وہ اپنا سوال بھولی نہیں تھی۔

”مدر کی ڈیوٹی تھ ہو گئی ہے اور فادر پاکستان میں ہوتے ہیں۔“

”اوہ ویری سیڈ“ ہمدردی کا اظہار۔

”آپ نے شادی نہیں کی؟“

”نہیں“

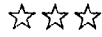
”کیوں؟“

”تم نے کیوں نہیں کی؟“ وہ الٹا پوچھ بیٹھا۔

”اچھا..... شادی..... کر..... لوں۔“ خود کلامی کا سا انداز وہ رک رک کر بولا۔
 ”کس سے کر لوں؟“ سوالیہ نظروں سے اس نے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو کہ عام سیاہ فاموں سے کافی حد تک مختلف تھی، گہری سانولی رنگت پر سفید چمکدار موتیوں جیسے دانت بھرے بھرے لب اور سیدھے بال، اس کے بال روایتی سیاہ فاموں کی طرح گھٹکھریالے نہیں تھے اس وقت وہ ایک ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور لوز ٹرٹ میں ملبوس تھی جس کی وجہ سے اس فکر کا اندازہ کرنا بے حد مشکل تھا اور پھر گلے میں ڈالا گیا اسکارف بھی اس کوشش میں رکاوٹ تھا۔

وہ اس کے یوں نظر جما کر دیکھنے پر کچھ کنفیوز ہو گئی مگر اگلے پل وہ خود پر قابو پا کر پراعتاد انداز میں بولی۔

”مجھے آپ سے ملے صرف دو گھنٹہ ہوا ہے، دو گھنٹہ یعنی ایک سو بیس منٹ اور یہاں بیٹھے ہمیں دس منٹ گزر چکے ہیں، یعنی..... ایک سو تیس منٹ..... اور..... مجھے لگتا ہے کہ میں آپ سے..... محبت کرنے لگی ہوں۔“ بے حد مشکل بات وہ بے حد آسانی سے کہہ گئی تھی، وہ ساکت رہ گیا تھا۔



”انکل کیا میں کچھ دیر کے لیے آپ کا کمپیوٹر یوز کر سکتی ہوں؟“ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر آتی وہ پوچھ رہی تھی انہوں نے نظر بھرا سے دیکھا، سوچ کا زاویہ بدلا، کیا تھا اگر یہ میری بیٹی ہوتی تو؟ کئی خیالات یکے بعد دیگرے ان کے ذہن سے گزر گئے اس کی آواز پر انہیں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

”بالکل بیٹے آپ کے کمپیوٹر کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ انہوں نے اجازت دیتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”جی وہ اصل میں شام کو جب لائٹ بند ہوئی تھی تو اس وقت میں کمپیوٹر پر تھوڑا سا کام کر رہی تھی اس لیے لائٹ آنے کے بعد میں نے اسے دوبارہ چیک کیا تو مین کنکیشن یکدم آف ہونے کی وجہ سے کمپیوٹر کی کچھ اپورٹس ونڈوز اور ڈیٹا ڈیلیٹ ہو

اب وہ ایک گھنٹے گھنٹے بعد وہ اس کے کمرے کا دروازہ بجارہی تھی، ڈسٹنگ کرنے کے بعد کچن کا جائزہ لے کر کافی اور سینڈوچ تیار کر چکی تھی اس کی مدھم سیس کی آواز سن کر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، ٹائٹ سوٹ میں وہ شاید بستر پر جانے ہی والا تھا، سلور گرے گاؤن میں اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک آسیر کو بے اختیار نظریں جھکا نے پر مجبور کر گئی۔

”وہ میں نے کافی بنائی تھی تو آپ بھی آجائیں میری وجہ سے آپ نے برگر بھی نہیں کھایا تھا، آپ کو اس وقت غصہ آیا تھا نا۔“ اور اسے غصہ تو اس وقت بے پناہ خود پہ بھی آ رہا تھا، کتنی کوشش کرتی تھی وہ کہ بات مختصر انداز میں دوسروں تک پہنچا سکے مگر اف یہ اس کے بے تحاشا بولنے کی عادت ضرور مروائے گی۔

”تم چلو میں آتا ہوں۔“ آواز میں بلا کی گھمبیرتا، آسیر کو اپنا دل کنپیوٹ میں دھڑکتا سنائی دیا۔

صرف ایک لمحہ لگا تھا اور شاید قرونوں کا فاصلہ سمٹا تھا صرف ایک لمحہ اور اسے لگا کہ وہ چاروں شانے چت ہو گئی ہو۔

وہ ساحر جادو گر جس کی سیاہ آنکھوں سے شاید کوئی برقی مہتابی طاقت نکلی تھی، جس نے آسیر عبدالرحیم کے دل کو اک پل میں اپنا اسیر بنالیا تھا۔



کچھ دیر بعد وہ کچن میں تین کرسیوں والے گول ٹیبل پر ایک دوسرے کے مقابل موجود تھے، ٹیوب لائٹ کی روشنی براہ راست از لان کے چہرے پر پڑ رہی تھی، آسیر نے اس کی پلیٹ میں سینڈوچ رکھتے ہوئے نظر جما کر اسے دیکھا، سیاہ چمکدار آنکھیں ٹیبل پر مرکز تھیں، اس کے دل کو بے اختیار کچھ ہوا، کافی کنگ کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے، نظریں جھکائے اس نے بات شروع کی۔

”آپ شادی کر لیں از لان۔“ اس کی دھیمی آواز پر بگ اس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بچا گروہ تیزی سے خود کو سنبھال گیا۔

”تم.....تم کیا چاہتی ہو؟“ وہ جھنجلا کر بولا۔

”یہ اچھا سوال ہے اس کا جواب یہ ہے کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، ہاؤفی، ایک سو بیس منٹ کی محبت، محبت (مدھم سی ہنسی) لیکن میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں از لان، میں آپ کو بتاؤں، میرا ہمیشہ سے ایمان تھا کہ ہم اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی اس انسان سے ضرور ملتے ہیں جو ہماری ذات کا گمشدہ حصہ ہوتا ہے ہمارا ساتھی، جسے دیکھتے ہی ہمارا دل ہمیں گرین سگنل دیتا ہے کہ ہاں یہ وہی ہے، جو ہمارا ہے، ہمارا اپنا اور آپ خود دیکھیں کس طرح آپ کو دیکھتے ہی میں آپ سے مدد کی درخواست کر بیٹھی، آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی، شاید میری روح نے اپنے پچھڑے ساتھی کو تلاش لیا ہے از لان، میری زندگی میں آج سے پہلے کوئی نہیں آیا مگر آج سے آپ میری زندگی کا حصہ ہیں از لان، وہ ایک لمحے کی بات تھی مگر وہ لمحہ میری ساری زندگی پر محیط ہے میں اس لمحے سے عشق کر بیٹھی ہوں، ساری زندگی اس لمحے کی جادوئی اثر سے باہر نہیں آسکوں گی اگر آپ مجھ سے شادی نہیں کرتے تو شاید میں یہاں سے چلی جاؤں۔ مگر میں ہمیشہ آپ کی رہوں گی، از لان ہمیشہ، کیونکہ یہ میرے دل کا فیصلہ ہے“ بھرایا ہوا لہجہ وہ تیزی سے اٹھ کر کچن سے نکل گئی۔

وہ اپنی الجھی ہوئی سوچوں کے ساتھ وہیں رہ گیا، دل و دماغ کے درمیان ایک جنگ چھڑ چکی تھی، محبت اور قسمت اپنے اپنے مہرے لے کر میدان میں آچکی تھیں زندگی کی بساط پر۔

”وہ میرا ہے، میں اسے اپنا بنا لوں گی“ محبت نے چال چل دی، قسمت زور سے ہنسی۔

”وہ تو ہمیشہ سے میرے شکبے میں پھنسا ہے“

”میں اسے تیرے جال سے نکال لوں گی“ محبت پر یقین تھی۔

”میرے جال سے آج تک کون نکل سکا ہے؟ تو بھی کوشش کر دیکھ“ قسمت

نے غرور سے دعویٰ کیا اور مہرے اٹھا کر چل دی۔

☆☆☆

گیا ہے اس لیے سوچا آپ کے کمپیوٹر سے کچھ مدد لے لوں“ وہ شاید پہلی بار ان سے اس قدر تفصیل سے بات کر رہی تھی۔

”اوہ یہ تو واقعی پر اہم ہو جائے گی خیر، سوچتے ہیں کچھ اس بار میں“ انہوں نے بات ختم کر کے مسکرا کر کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی کرسی سنبھال کر کمپیوٹر کے سامنے جم گئی، اس کے ہاتھ مہارت سے کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھے۔

وہ بے خیالی میں اسے دیکھنے لگے، سفید اور سرخ امتزاج کے خوبصورت شلوار سوٹ میں دو پٹہ سلیٹے سے شانوں پر پھیلائے اپنی لمبی چوٹی کو آگے ڈالے جو کہ اس کی گود سے ہوتے ہوئے کرسی کے پائے کو چھو رہی تھی چہرہ کسی بھی قسم کی آلائش سے مبرا تھا، کانوں میں چھوٹی چھوٹی سونے کی بالیاں اور بس، وہ انہیں اس لمحے بے پناہ خوبصورت اور معصوم لگی، اچانک ایک اچھوتا خیال ان کے ذہن کو چھو گیا، یہ میری بیٹی ہی تو ہے، اگر از لان اور حرا کی شادی ہو جائے تو یہ میری بیٹی ہی تو تو ہوگی۔

ہائے یہ نادان دل خوش فہم۔

☆☆☆

”شٹ اپ جسٹ شٹ اپ“ کپ ٹیبل پر پختا وہ ہتھے سے ہی اکھڑا گیا جبکہ اس کے برعکس وہ بہت پرسکون انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ بے حد اشتعال میں تھا۔

”میں جانتی ہوں“

”کتنا جانتی ہو میرے بارے میں؟ ہاں کتنا؟“

”جتنا میرے دل نے جان لیا کافی ہے“

”مس آسیہ عبدالرحیم آئی ڈونٹ لائیک جوکس“ وہ چبا چبا کر بولا تو وہ کھلکھلا

کر بنس دی۔

”آپ اردو میں بات کریں از لان، میں نے سولہ ماہ لگا کر یہ زبان سیکھی ہے

پہلی بار بولنے کا موقع ملا ہے“ وہ جیسے مزہ لیتے ہوئے بولی۔

یاد آیا۔

As you sow, so shall you reap

سترہ سال تک میں اسے دھتکارتا رہا اس سے نفرت کرتا رہا اسے کبھی محبت نہ دی، کبھی شفقت نہ دی، کبھی اسے اپنا بیٹا ہی نہیں مانا، اب اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو مجھے برا کیوں لگ رہا ہے؟ کیوں یہ دل درد سے پھٹ رہا ہے؟ کیوں ایسا سوچا میں نے کہ جو میں نے اسے دیا ہے وہ مجھے وہی واپس نہ لوٹائے گا۔
وہ تو کچی لکڑی تھا، نازک جس طرف اسے موڑا وہ مڑ گیا۔

”برتن تو خالی تھا جو کچھ اس میں فیڈ ہوا میں نے ہی تو کیا، اب دکھ کس بات کا“ یہ شاید ان کی خود اذیتی کی انتہا تھی۔

ذہنی طور پر وہ درد، تکلیف، خود اذیتی اور خود انتقامی کی اس انتہا پر پہنچ چکے تھے کہ انہیں لگا آج ضرور ان کی دماغ کی شریان پھٹ جائے گی یا پھر تیسرا ہارٹ اٹیک تو ضرور ہی ہو جائے گا، مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

شاید میں اتنا بے حس ہو چکا ہوں کہ مجھ پر کوئی بات اثر نہیں کرتی، کوئی صدمہ میرے لیے جان لیوا ثابت نہیں ہوتا کوئی بات، کوئی چیز، کوئی سانحہ، کچھ بھی اتنا طاقتور نہیں کہ میرے جسم سے روح کھینچ کر لے جائے اور میں اس اذیت کے چکر سے آزاد ہو جاؤں۔
میرے بیٹے کی، میرے ازلان کی بدگمانی بھی اتنی طاقتور نہیں؟ خود سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، جو کہ نجانے کب تک جاری رہتا، سینے میں اٹھنے والا درد اتنا شدید تھا کہ وہ ایک طرف کولڑھک گئے۔

☆☆☆

اس نے ہاتھ میں پکڑا کارڈ لیس پوری قوت سے دیوار پر دے مارا اور زمین پر گھٹنوں کے بل گر گیا۔

”کچھ نہیں لگتا میں آپ کا، کچھ بھی نہیں، برباد کر دیا آپ نے مجھے، مر چکا ہوں میں آپ کے لیے“ وہ بھرپور چوڑا چکلا مرد اس لمحے پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی

سکندر حیات گردیزی آج فیصلہ کر کے اٹھے تھے کہ انہیں آج ہر صورت ازلان سے بات کرتی ہے اسے منانا ہے چاہے کچھ ہو جائے وہ آج ہر صورت اس کو سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ وہ اب بس کر دے ان سے اب اور اس آگ میں زندہ رہنا ممکن نہیں رہا، اب وہ مزید اس کے بے وقوفانہ فیصلوں میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتے، اسے ہر صورت واپس آنا ہوگا، اسے اپنے باپ کی بات ماننی پڑے گی۔
انہوں نے رات میں اس کا نمبر ملایا، حیرت دوسری طرف گہری خاموشی تھی نہ سلام نہ دعا۔

”کیوں کرتے ہیں فون؟“ چبھتا ہوا لہجہ انہیں اندر تک گھائل کر گیا۔

”ازلان میرے بچے، اب بس کرو باپ کا اتنا مت امتحان لو“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں، خدا کے لیے اس رشتے کو گالی مت دیں، آپ کو کیا پتا باپ اور بیٹے کا رشتہ کتنا مقدس ہے؟“ وہ دھیمے لہجے میں پھنکار رہا تھا۔
”ازلان میری بات سنو“ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر وہ ان کی بات قطع کر گیا۔
”آپ نے مجھے کہا تھا کہ میں اپنی منحوس شکل آپ کو کبھی نہ دکھاؤ سو میں اب کبھی نہیں دکھاؤں گا، کیونکہ میں کبھی واپس ہی نہیں آؤں گا، میں آپ کے لیے شرمندگی کا باعث ہوں نا، اس لیے مجھے بھول جائیں، فراموش کر دیں اس حقیقت کو کہ کبھی آپ کا بیٹا تھا، کچھ نہیں لگتا میں آپ کا، کچھ بھی نہیں“ کتنا درد تھا اس کے لہجے میں۔

”اگر آپ نے مجھے دوبارہ فون کیا تو میں اپنا نمبر بدل لوں گا“ فون بند ہو چکا تھا۔
”دور ہو جاؤ میری نظروں سے، نفرت کرتا ہوں میں تم سے، منحوس ہو تم، باعث شرمندگی ہو میرے لیے، جی چاہتا ہے اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں تمہارا، میرے سامنے مت آیا کرو“ سکندر کی اپنی آواز کی بازگشت ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، انہیں لگا کمرے کی ہر چیز ان پر ہنس رہی ہو قہقہے لگا رہی ہو۔

بہت پرانا محاورہ تھا شاید انہوں نے سسکتھ کلاس میں پڑھا تھا، انہیں بے اختیار

میں لے کر بھیج دیا، اس نے از لان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، جس کی بھیگی ہوئی قاتل آنکھیں اس وقت اسے پاگل کر رہی تھی، جنونی بنارہی تھیں۔

”سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں (خود کلامی انداز) سب مجھ سے دور بھاگتے ہیں کوئی میرا نہیں..... کوئی بھی نہیں..... کوئی نہیں.....“ وہ بلند آواز میں چلایا۔

”غلط سوچ ہے آپ کی..... بالکل غلط..... ایسا نہیں ہے“ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی تھی از لان نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

”کسی سے نہیں ملنا چاہتا میں، چلی جاؤ یہاں سے چلی جاؤ“ وہ بلند آواز میں چیخا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی، وہ پاگلوں کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا، ضبط سے بھینچی ہوئی مٹیوں کے ساتھ وہ کچھ بڑاڑا ہاتھا۔

☆☆☆

حرا انہیں دودھ دینے آئی تھی مگر انہیں یوں آڑھا تر چھا بستر پر گرے دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی، وہ اٹنے پاؤں واپس بھاگی۔

ہاسپٹل کے ٹھنڈے کوریڈور میں وہ بے یار و مددگار بیٹھی تھی، آنسو تہج کے موتیوں کی مانند اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے، ڈاکٹر ایاز کو آتا دیکھ کر وہ تیزی سے ان کے قریب آئی۔

”انکل کیسے ہیں؟“ آنسوؤں کی یورش کے سبب اس سے مزید بولا نہ گیا۔

”تم خود ڈاکٹر بننے کے پر اس سے گزر رہی ہو حرا، سمجھ سکتی ہو، سکندر کا بی بی کنٹرول میں نہیں آ رہا اگر مزید کچھ دیر ہم ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو اس کی نس پھٹنے کا اندیشہ ہے اور ہارٹ اٹیک کے امکانات تو پہلے سے ہی روشن ہیں“ وہ بات کرتے کرتے تلخ ہو گئے۔

”اب بتاؤ میں تمہیں کیا امید دلاؤں؟“ انہوں نے اس کے ترچہ پرے کو دیکھتے ہوئے کہا، وہ سسک اٹھی۔

”میں انہیں دیکھ سکتی ہوں“ وہ پوچھنے لگی تو وہ بھی سر ہلا کر آگے بڑھ گئے۔

طرح رور ہاتھا۔

”آپ کی وجہ سے نفسیاتی مریض بن چکا ہوں میں، میں کبھی دوست نہیں بنا سکا، کبھی آؤٹ ڈور سرگرمیوں میں حصہ نہ لے سکا، کبھی کھل کر مسکرا نہ سکا، آپ کی نفرت نے مجھے مار دیا، برباد کر دیا، کیسے بھول جاؤں سب کچھ؟ کیسے؟ نفرت کرتا ہوں آپ سے سکندر حیات گردیزی صاحب، شدید نفرت، کبھی معاف نہیں کر سکتا آپ کو، کبھی نہیں“ چیخ چیخ کر بولتے اس کا گلا بیٹھ گیا اب اس کی دھیمی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

”میرا بچپن شاید کبھی آیا ہی نہ تھا، آپ نے آنے نہ دیا، لوگ اپنے بچپن کو یاد کرتے ہیں خوش ہوتے ہیں، اپنی شرارتیں یاد کرتے ہیں محفوظ ہوتے ہیں اور میں، میرے پاس کیا تھا؟ صرف آپ کی نفرت بھری نگاہیں، آپ کے ان گنت بار مارے گئے تھپڑ، آپ کی شعلے اگتی آنکھیں اور بددعاں دیتی زبان، پاگل کر دیا تھا آپ نے مجھے، بلکہ نفسیاتی مریض بنا دیا مجھے، اب بھی وہی ہوں میں، وہی میری منحوس شکل ہے اور ناقابل برداشت وجود پھر اب کیسے گوارہ کر لیا مجھے، کیسے بیٹا ماننے پر مجبور ہو گئے؟“ وہ سر ہاتھوں میں تھامے رور ہاتھا۔

”یہ سب آپ اس لیے کر رہے ہیں کیونکہ اب آپ کو اپنی بے شمار دولت اور جائیداد کا وارث چاہیے نا اور وہ میرے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے، مگر مجھے کچھ نہیں چاہیے، نہ آپ کی دولت نہ جائیداد، کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے، جب آپ کی محبت اور شفقت میں میرا حصہ نہیں تھا تو دولت میں بھی نہیں ہونا چاہیے، بالکل نہیں ہونا چاہیے“ وہ ہلک رہا تھا، جب اچانک دروازہ کھول کر آسیہ اندر داخل ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ کک..... کیا..... ہوا..... ہے؟“ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکتی بے تابی سے پوچھ رہی تھی۔

”از لان..... آخر ہوا کیا ہے؟“ اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔

وہ بے اختیار اس کے ہاتھوں پر سر رکھ کر رو دیا، آسیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی

کوئی حرج نہیں، تو یہ راہ خازن کیوں؟ اگرچہ انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے، مگر بعض دفعہ ٹھوکر ایسے مقام پر لگتی ہے جب انسان اس سے سبق سیکھنے کے قابل نہیں رہتا۔
اپنی غلطی کو سدھارنا تو شاید چاہتا ہے مگر موقع نہیں ملتا اور انہیں بھی یہ موقع نہیں ملا تھا۔

”سکندر حیات گردیزی“ انتہا پسند، شدت پرست اور سدا کے جنونی اور دیوانگی کی حد تک حسن پرست۔

وہ ہمیشہ محبت اور نفرت کی انتہا پر رہے، شاید اپنے جذباتوں میں بہت شدت پسند تھے، ان کی بیوی شازمہ ان کی محبت کی انتہا، ان کا بیٹا ازلان ان کی نفرت کی انتہا اور یہی انتہا پسندی ان کی بربادی کی وجہ بن گئی۔

جتازے کے وقت ان کی میت کو کاندھا دینے والا کوئی خون کا رشتہ موجود نہ تھا۔
ان کی وسیع و عریض جائیداد، دو فیکٹریز، شوگر مل، پلازہ اور ہاسپٹل کی پاور آف اتارنی حرا کو دی جا چکی تھی اور یہ اسی صورت ازلان سکندر کو ملتی اگر وہ حرا احتشام سے شادی کرتا۔

ان کے سوئم کے بعد ڈاکٹر ایاز نے اسے تیار شدہ فائل دی اور ساتھ ہی تفصیلات بھی بتادی تھیں۔

”مجھے یہ سب نہیں چاہیے“ اس نے فائل نہیں پکڑی تھی، رونے کی وجہ سے خوبصورت آنکھیں جل تھل ہو رہی تھیں۔

”بیٹا یہ میرے پاس آپ کی امانت ہے مجھے ہر حال میں آپ کو دینا ہے اس لیے اسے رکھ لو“ ڈاکٹر ایاز نے اسے نرمی اور محبت سے سمجھایا۔

”مجھے کیا کرنا ہے ان سب بے جان چیزوں کا، میں تو پھر ایک بار اکیلی ہوں“ وہ دلسوز لہجے میں بولی تو بیگم ایاز اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

”تمہارے انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں حرا، یہ سب تمہارا ہے اور پھر جب ازلان آئے گا تو سب خود دیکھ لے گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور پھر تم اکیلی

حرا نے مشینوں میں جکڑے ان کے بے بس وجود کو دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے ان کے صحت یاب ہونے کی دعا مانگی تھی۔

کتنے اچھے تھے وہ بالکل پایا کی طرح لگتے اسے اتنا پیار سے بات کرتے، اتنا خیال رکھتے کہ بہت مرتبہ اس کا دل چاہا ان سے پوچھے کہ کیا وہ انہیں پایا کہہ کر بلا سکتی ہے، مگر اپنی ازلی جھک کی بنا پر پوچھ نہ سکی۔

ہر وقت میں ٹین، نک سک سے تیار رہتے، سنہرے فریم کے چشمے میں وہ کتنے شاندار لگتے تھے، اگر انہیں کچھ ہو گیا تو؟ ایک بے رحم سوچ نے دل پر قبضہ جمایا، وہ تھرا کر رہ گئی، ایک دم اس نے نرس کو باہر آتے دیکھا اور پھر سن ذہن کے ساتھ ڈاکٹر ایاز کو اندر جاتے دیکھتی رہی۔

ڈاکٹروں کا پورا ہسپتال ان پر جھکا ہوا تھا، انہیں بچانے کی کوششوں میں مصروف، حرا نے دل سے ان کی عمر درازی کی دعا مانگی مگر قبولیت کی گھڑی غالباً گزر چکی تھی، اس نے ڈاکٹر ایاز کو سکندر حیات کا چہرہ سفید کپڑے سے ڈھانپتے دیکھا اور ناگوں نے مزید بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا، ارد گرد کا منظر دھندلا گیا اور بے ہوش ہو کر زمین پر آ رہی۔

☆☆☆

کسی بھی چیز کی انتہا اس کی بربادی کا نقطہ آغاز ہے، یہ انتہا خواہ محبت کی ہو یا نفرت کی، انسان کو برباد کرنے کی بنیاد بنتی ہے۔

انتہا	سے	شدت	پسندی
شدت	پسندی	سے	جنون
جنون	کیا	ہے؟	
صرف	تباہی،	مکمل	تباہی

انسان اپنے لیے اتنے مشکل راستے کیوں چنتا ہے؟ کیوں وہ حاصل شدہ نعمتوں کا شکر ادا کرنا نہیں سیکھتا؟ کب تک ٹھوکر کھا کر سنبھلتا رہے گا، کب تک؟ آخر جینے کے لیے اتنے کشت کیوں جھیلتا ہے؟ زندگی کو سہل اور سیدھے راستے پر گزارنے میں اگر

”اگر کوئی پر اہم ہے تو آپ میرے ساتھ شیئر کر سکتے ہیں“ اس نے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

ازلان نے بے اختیار پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا، وہ کچھ کنفیوز ہو گئی، اگلے ہی لمحے وہ نظریں جھکا چکا تھا، آسیہ نے ایک طویل سانس کھینچا۔

”شاید اسے معلوم ہے کہ اس کی آنکھیں کس قدر خوبصورت اور سحر انگیز ہے، اس لیے نظر اٹھاتا نہیں، اے خوبصورت انسان مجھے حیرت ہے کہ اب تک تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی کیونکہ آتا تو صرف مجھے تھا۔“ وہ دل ہی دل میں قائل ہو کر خود سے کہہ رہی تھی۔

”میرے پاس پیسہ بہت ہے آسیہ! میرا اپنا پیسہ، میری خود کی کمائی ہوئی دولت، صرف اپنے بل بوتے پر کمائی گئی دولت ہے اپنی دولت اس لیے کیونکہ میری دولت الگ، میرے باپ کی الگ، یونو میرے پاس گولڈ کارڈ ہے، کیونکہ کریڈٹ کارڈ، ڈبیٹ کارڈ، جو آج کل ہر ایک کے پاس ہے، اس کی ریزن پتا ہے کیا ہے؟“

”میرے بہت زیادہ اخراجات نہیں ہیں، صرف زندگی کے لوازمات مطلب، صرف روزمرہ کی ضروریات جیسے کھانا، پینا، صرف اس لیے میرے پاس بہت زیادہ دولت ہے اور میں نہیں جانتا کہ اسے کہاں خرچ کروں۔“

”کیا مطلب؟ مجھے سمجھ نہیں آئی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ آسیہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی اور اس سے زیادہ اس کی گفتگو پر حیران تھی۔

”میں نے ایک راستہ سوچا ہے، اپنی اس بے شمار دولت کو خرچ کرنے کا ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں، اس سے ہم دونوں کے فوائد (Benifits) سکیور ہو جائیں گے نہ تمہیں Monthly allowance (ماہانہ الاؤنس) پر گزارہ کرنا پڑے گا اور فری میں رہنے کے لیے گھر بھی مل جائے گا، کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا سب فری اور مجھے بغیر پے کے ایک فل ٹائم ہاؤس میڈل جائے گی، کیا خیال ہے؟“ اس نے مسکرا کر آسیہ کی آنکھوں میں جھانکا اور آسیہ کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا، اتنے دلچسپ انداز میں آج تک

کہاں ہو، میں آتی رہا کروں گی، تمہارے انکل بھی چکر لگاتے رہیں گے“ انہوں نے اسے تسلی دی۔

”آئی یہ ازلان کون ہے؟“ پہلی بار وہ کچھ چونک کر پوچھ رہی تھی باوجود اس کے کہ سکندر حیات کی وفات کے بعد صرف اسی نام کی بازگشت تھی گھر میں، مگر وہ اس قدر غم و اندوہ کی کیفیت میں تھی باوجود کوشش کے یاد نہ کر سکی کہ وہ کون حضرت ہیں، جانتی ہوتی تو کچھ یاد آتا ناں۔

”تم ازلان کو نہیں جانتیں، حیرت ہے، خیر تمہیں یہاں آئے ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے جو تم اسے جان پاتیں، وہ تمہارے سکندر انکل کا بیٹا ہے، لندن میں ہوتا ہے“ مسز ایاز نے اس کی لائٹلی پر حیرت زدہ ہوتے ہوئے اسے ازلان کے متعلق بتایا۔

”لیکن وہ آئے کیوں نہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”اس کی تفصیل تمہیں تمہارے انکل بتائیں گے“ انہوں نے خاموش بیٹھے ایاز کی طرف دیکھ کر کہا۔

”وقت آنے پر بتا دیا جائے گا“ ایاز صاحب نے کچھ اکھڑے لہجے میں کہا۔
”ایسی کیا بات ہے؟“ وہ دل میں حیران تھی، سکندر حیات کے بیٹے کی حیران کن آمد اور مستزاد درمیان میں کلکیشن بھی تھا۔

☆☆☆

سلاٹس کی پلیٹ میز پر رکھنے کے بعد وہ خود بھی کرسی پر آ بیٹھی، کافی کا مگ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا، اس کی آنکھیں سرخ، متورم اور سو جھی ہوئی تھیں، آسیہ نے بے ساختہ اسے دھیمے سے پکار لیا۔

”ازلان!“

”ہوں۔“

ازلان نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں یک نک وہ کافی کے مگ سے ٹکٹی بھاپ پر نظریں جمائے بے خبر تھا۔

”پھر کوشش کیا کر رہے ہیں آپ؟“ وہ کچھ جھنجھلا کر بول اٹھیں۔

”انٹرنیٹ کے ذریعے پتا چلانے کی کوشش کر رہا ہوں وہ لندن کے بہت مشہور ہسپتال میں کام کرتا ہے اور ایسے ہسپتالوں کی اپنی ویب سائٹس ہوتی ہیں جن پر ان کے ڈاکٹرز کی مکمل ڈیٹیلز ہوتی ہیں“ ان کی بات سن کر آمنہ کچھ سوچ میں پڑ گئیں۔

”مجھے حرا کی فکر ہے آمنہ، وہ بہت اکیلی ہے“ وہ تاسف سے کہہ رہے تھے۔

”مجھے تو ترس آتا ہے اس بچی پر اور سکندر کی خود غرضی دیکھیں کہ وہ سب کچھ از لان اور حرا کی شادی سے مشروط کر گیا ہے، اب حرا صرف از لان سے شادی کر سکتی ہے ورنہ اسے ایک پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی اور دوسری طرف از لان ہے جس کا کچھ پتا نہیں ہے اور مجھے نہیں لگتا ایاز کہ اسے باپ کے مرنے کا کوئی فرق پڑے“ وہ ناگواری سے کہہ رہی تھیں جبکہ ایاز تڑپ اٹھے۔

”اے سکندر کی خود غرضی مت کہہ آمنہ، وہ دل سے چاہتا تھا کہ حرا اور از لان ایک ہو جائیں“

”آپ بھول رہے ہیں ایاز، دو فریقین کی مرضی کے بغیر زبردستی کا بندھن نہیں باندھا جاسکتا“

”اوہ کم آن آمنہ کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو، حرا ابھی بالکل کسن ہے اسے اتنی سمجھ کہاں کہ وہ مرضیاں چلا سکے اور از لان کو اپنے باپ کے فیصلے کا بلکہ وصیت کا پاس ضرور ہوگا“ وہ ناگواری سے بولے۔

”میں جانتی ہو ایاز آپ کے دوستانہ جذبات کو نہیں پہنچی ہے“ وہ تکیے لہجے میں بولیں۔

”لیکن جب از لان باپ کے حکم پر یہاں نہیں آیا تو حرا سے شادی کرنے ضرور ہی آئے گا“ وہ طنزیہ بولیں۔

”پلیز آمنہ میرے ساتھ اب اس موضوع پر بات مت کرنا“ وہ بھڑک گئے تو آمنہ بھی جزبہ ہو کر چپ ہو رہیں۔

یقیناً کس نے کسی کو پر پوز نہیں کیا ہوگا۔

”از لان آپ..... آپ“ وہ حیرت و خوشی کی شدت سے بات مکمل نہیں کر پائی۔

”مجھے تو کچھ اور بھی مفت مل رہا ہے آسیہ، پتا ہے کیا؟“

”کیا؟“

”تمہاری ایک سوتیلی منٹ کی محبت“ اس کا شرارت بھرا لہجہ، دونوں کا بے ساختہ قہقہہ گونجا اور از لان کا دل زندگی میں پہلی بار مطمئن انداز میں دھڑکا تھا، زندگی نے اپنی دھن بدل لی تھی، محبت نے غرور سے قسمت کو دیکھا اور اسے اپنے دربار سے بے دخلی کا حکم دے دیا۔

یہ محبت کا دربار تھا جہاں وہ ملکہ تھی اور عشق بادشاہ، محبت نے فیصلہ سنایا اور عشق نے اس پر عمل کے احکامات دے دیئے، قسمت وہاں سے ناکام ہو کر نکلی تھی۔

☆☆☆

نیگم آمنہ ایاز نے حرا کو گلے لگایا، اس کا ماتھا چوما اور رخصت ہو گئیں، انہیں حرا کے ساتھ رہتے دس دن ہو چکے تھے اور اب وہ واپس جا رہی تھیں کیونکہ ان کی بہوان کے بغیر اداس تھی، ڈاکٹر ایاز اور آمنہ ایاز کے دو بچے تھے، بیٹی شادی شدہ اور بیٹا ایک بینک میں منیجر تھا، آج ان کے بیٹے کو کسی کام سے کراچی جانا تھا اس لیے ان کا گھر جانا آج بے حد ضروری تھا۔

”از لان سے کوئی رابطہ ہوا؟“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے ڈاکٹر ایاز سے پوچھا۔

”نہیں لیکن میں کوشش کر رہا ہوں“ انہوں نے گیسر بدلتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا وہ فون نہیں اٹھاتا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”وہ اپنا نمبر بدل چکا ہے“

”اور اس کی رہائش گاہ کا پتہ بھی نہیں ہے آپ کے پاس“

”نہیں، اس کی رہائش کے بارے میں تو سکندر بھی نہیں جانتا تھا“

کی سیننگ بدلتی رہتی، آج اس نے سکندر صاحب کے کمرے کی صفائی کرنے کا سوچا۔ ملازمہ سے ڈسٹنگ کروانے کے بعد وہ وارڈ روب اور سائیڈ ٹیبلو کی درازیں چیک کرنے لگی۔

مختلف فائلز، پرانے اخبارات، ایک آدھ کتاب 28 مئی 1998ء کے اخبار کا تراشہ جس پر عبدالقدیر خان کی تصویر بھی تھی اور ایٹمی دھماکوں کی تفصیلات تھیں۔ وہ سب کچھ سائیڈ پر ڈھیر کرتی جا رہی تھی، آنکھوں میں آنسو تھے درد بھرے آنسو، انسان چلا جاتا ہے یادیں چھوڑ جاتا ہے، آخر یہ سب انہوں نے کسی نہ کسی یاد کے طور پر ہی سنبھالی تھیں اور اب وہ خود قصہ پارینہ بن چکے تھے۔

آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے کچھ اور چیزیں باہر نکالیں اور ٹھنک گئی یہ کچھ تصویریں تھیں، سکندر کی شادی کی تصویریں، اس نے حیرت اور جوش سے سارا دراز خالی کر دیا، سب کچھ نکال سامنے ڈھیر کر لیا پہلی تصویر میں سکندر دلہا بنے کھڑے تھے اور پہلو میں موجود لڑکی شرمائی سی بہت خوبصورت لگ رہی تھی اس نے کچھ تجسس کے عالم میں اگلی ساری تصویریں دیکھیں، وہ سب کم و بیش شادی کی تھیں، کچھ شاید شادی کے بعد کی تھیں کچھ کلوز اپ لئے گئے تھے جن میں لڑکی کا حسن و جمال بے حد نمایاں اور مٹاثر کن لگ رہا تھا، تصویریں ختم ہو گئیں تھیں اس ایک کاغذ پکڑا اور اسے جھٹکا لگا، وہ برتھ سرٹیفکیٹ کی فوٹو کا پی تھی اس نے غور سے پڑھا۔

”ازلان احمد ولد سکندر حیات گردیزی، والدہ شازمہ سکندر (تاریخ 21 دسمبر)؟“ اس نے بے تابی سے باقی چیزوں کی تلاشی لی ایک تصویر اس کے ہاتھ آگئی اس نے غور سے دیکھا وہ ایک بچے کی تصویر تھی، گندی رنگ اور عام سے نقوش والا بچہ اگر سکندر اور شازمہ کا بیٹا تھا بھی تو کہیں سے لگ نہیں رہا تھا اور سب سے خاص چیز جو اس کے گندی رنگت والے چہرے پر تھی۔

اس کی پیشانی سے شروع ہو کر کان کی لوت تک پھیلا ہوا سیاہ نشان جو حیرت انگیز طور پر چاند کی شکل میں تھا جیسے ابتدائی تین دن کا چاند باریک، آدھی چوڑی سے

زندگی ایک مسلسل بہاؤ کا نام ہے کبھی موجیں نشیب میں ہوتی ہیں تو کبھی فراز پر یہ نشیب و فراز زندگی کا جزو مسلسل ہے اس بہتی ہوئی زندگی میں لوگ ہمیں ملتے ہیں، بہت سے انجان، بہت سے آشنا، بگھڑتے ہیں، تڑپاتے ہیں اور اپنی یادیں دلوں پر نقش کرتے جاتے ہیں، پہلے پہل ان کی جدائی دل میں ایک گھاؤ سا ڈال دیتی ہے زہر میں ڈوبے خنجر کا گھاؤ، گزرتا وقت ہماری روزمرہ کی مصروفیات ہمارے مقاصد، ہمارے ارادے اور شاید ہمارا دماغ سب مل کر اس خنجر کو نکال دیتے ہیں، جدائی کا خنجر، یہ زہر یلا خنجر نکل تو جاتا ہے مگر زخم رہ جاتا ہے یہ زخم، اس کی درد، تڑپ اور اذیت ہماری آنکھوں سے آنسو بہاتی ہے ہمیں رونے پر مجبور کرتی ہے مگر کتنی دیر؟ بالآخر ایک وقت ایسا آتا ہے یہ گھاؤ بھی بھر جاتا ہے، آنسو ختم جاتے ہیں، صبر آ جاتا ہے مگر اس گھاؤ کا اس زخم کا داغ دل پر ہمیشہ رہتا ہے، انسان تو ہر پانی کی مچھلی ہے ہر طرح کے ماحول، ہر طرح کے حالات میں ایڈجسٹ کر جاتا ہے، سب کے بغیر جینا سیکھ لیتا ہے تنہا جینا سیکھنا پڑتا ہے۔

حرا نے بھی سیکھ لیا تھا، سکندر حیات کی وفات کو چھ ماہ ہو چکے تھے اب حرا کو اس محل جیسے گھر سے وحشت نہیں ہوتی تھی، جہاں رشتوں کے سوا دنیا کی ہر سہولت موجود تھی، تین چار بجے تک وہ یونیورسٹی سے لوٹی، کھانا کھانے اور چینیج کرنے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ پڑھنے بیٹھ جاتی، پڑھنے لکھنے کا یہ سلسلہ عام طور پر چھ بجے سے شروع ہو کر رات نو بجے تک چلتا اسی دوران وہ عصر اور مغرب کی نماز بھی پڑھتی، شام کی چائے عام طور پر نور بی بی اس کے کمرے میں دے جاتیں، نور بی بی ازلان کی آیا تھیں، ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود وہ بہت چاک و چوبند تھیں وہ جب بھی آتیں حرا کتاہیں نوٹس پھیلائے کمپیوٹر آن کیے مصروف نظر آتی،

وہ کڑھتی تھیں ہمیشہ اسے سمجھاتی کہ کمرے سے باہر نکلے لوگوں سے ملے جلے کہیں گھومے پھرے، مگر پھر تھک کر چپ ہو جاتیں کہ جانتی تھی وہ کم گو اور اپنے آپ میں گم رہنے والی لڑکی ہے جسے دوستی کرنے اور ملنے ملانے سے کچھ خاص شغف نہ تھا۔

چھٹی کا دن تھا حرا چھٹی کے دن اپنی نگرانی میں ڈسٹنگ کرواتی اور اکثر چیزوں

کے سوا کوئی بھی موجود نہ تھا اور آسیہ کی چار پانچ دوستیں تھیں، ازلان دل میں مطمئن تھا اگرچہ اس نے یہ فیصلہ جلد بازی میں کیا تھا بنا کچھ سوچے سمجھے اپنی اٹھائیس سالہ زندگی میں سنا جانے والا واحد فقرہ ”میں آپ سے محبت کرتی ہوں“ اسے پاگل کر دینے کو کافی تھا، کیا ہوتا ہے اس شخص کا حال؟ جو ساری زندگی خوشی کو ترسا ہو، ساری عمر محبت کے پیچھے بھاگتا رہا؟ کہتے ہیں نا جس چیز کے پیچھے جتنا بھاگو وہ اتنی ہی آپ کی دسترس سے دور ہو جائے گی، اس لیے جب اس نے محبت، توجہ اور خوشی جیسے سراہوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑا، وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔

وہ ہمیشہ سکندر گردیزی کی محبت کو ترستا رہا اور جب اس نے یہ خواہش چھوڑ دی تو وہ اس کے پیچھے بھاگنے لگے اسے واپس بلانے لگے۔

جو چیز طلب پر نہ ملے، وہ اپنا اثر کھودیتی ہے، اسی لیے اب سکندر کی توجہ اسے خوش نہیں کر رہی تھی، وہ ان کا فون نہیں اٹھاتا تھا اور جب پہلی بار اٹھایا تو وہ سب کہہ دیا جو برسوں سے اس کے اندر جمع ہو کر لاوے کی شکل اختیار کر چکا تھا اور اس لاوے کو کبھی نہ کبھی تو پھٹنا تھا سو اس دن وہ ضبط کھو بیٹھا تھا۔

یہ جانے بغیر کہ اس کی برسوں کی خاموشی جب ٹوٹی تو کسی کی جان لے گئی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے آسیہ کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ تنہا رہتے رہتے تھک چکا تھا، اس کی باتونی فطرت نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس کی بے ساختگی، بولڈ نیس اسے بھاگئی۔ اس کا دل چاہنے لگا یہ بولتی مینا اس کے گھر رہے، اس کا دھیان اذیت ناک سوچوں سے نکال دے، اسے اپنی طرف متوجہ کرے، شاید یہ خود غرضی تھی، سفاکیت کی حد تک خود غرضی لیکن وہ کر بیٹھا تھا باوجود یہ جاننے کے کہ وہ آسیہ کو کچھ بھی نہیں دے سکے گا، شاید کچھ بھی، سوائے اپنے بینک بیلنس کے اور اپنے سر و وجود کے سوا۔

نہ اپنی توجہ

نہ محبت

نہ چاہت

مشابہہ وہ سیاہ نشان یقیناً چاند گرہن تھا“

اسے یکے بعد دیگرے حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے، پھر اس نے اخبار کا وہ تراشہ اٹھالیا جو سب سے نیچے تھا اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

وہ ازلان کی تصویر کو ایک نک گھور رہی تھی، یہ اخبار میں اس کی تصویر اس کی انٹرویو کے ساتھ چھپی تھی، میٹرک کے رزلٹ میں ملک بھر میں ٹاپ کرنے والا سٹوڈنٹ ”ازلان احمد“ سولہ سترہ سال کا وہ نوعمر لڑکا جس کے بال سلیقے سے جھے تھے اپنی سیاہ سحر انگیز آنکھوں سمیت بے حد کنفیوز لگ رہا تھا، اگلے تراشے میں اسے وزیر اعلیٰ کی طرف سے میڈل پہنایا جا رہا تھا، سرخ شرٹ اور نیلی جینز میں دبلا پتلا بے حد چارمنگ لگ رہا تھا اور کلوز اپ میں لی گئی اس تصویر میں اس کے چہرے کا چاند بے حد نمایاں تھا۔

اس نے کچھ تجسس اور بے چینی سے باقی ساری چیزیں چھان ماریں مگر کچھ اور کیونہیں مل سکا تھا، اس کے ذہن میں یکدم بہت سے سوال سر اٹھانے لگے۔

اتنا جینس لڑکا آخر باپ سے کس بات کی ناراضگی ہوگی؟ اور انکل سکندر کی وہ وصیت کہ میری شادی صرف ازلان سے ہی ہوگی اس کا کیا؟ اگر ازلان واپس نہیں آتا تو؟ مجھے انکل ایاز سے بات کرنی چاہیے۔

آخر یہ سار قصہ کیا ہے؟ شازمہ آنٹی کہاں ہیں؟ کیا ان کی ڈیوٹی ہو گئی؟ وہ کچھ اور بھی الجھی تھی۔

”مجھے ان سے جاننا چاہیے“ ایک فیصلہ کر کے وہ اٹھ گئی۔

شام میں انکل ایاز کو فون کر کے وہ آنے کی پریشن لے چکی تھی یہ کہہ کر کہ اسے ضروری بات کرنی ہے اس نے ہینڈ بیگ میں ازلان کا برتھ سرٹیفکیٹ، اخبار کا تراشہ اور اس کی تصویر ڈالی اور کار میں بیٹھ کر ڈرائیور کو چلنے کو کہا اور خود سیٹ کی پشت سے سر نکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

نکاح کی تقریب بے حد سادگی سے انجام پائی، ازلان کے دو تین خاص کولیگز

اک وارفتہ نظر بھی نہیں

اگر اے محبت ملی ہوتی تو شاید بانٹنے کا ہنر بھی جان لیتا، دوسری طرف آسیہ تھی

بے پناہ خوش مانو ہواؤں میں اڑ رہی تھی اسے پا کر۔

ازلان کو خاموش رہنے کی عادت تھی، آسیہ کو بے تحاشہ بولنے کی، وہ قہقہہ لگانے والی بات پر صرف مسکراتا اور آسیہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بلند و بانگ قہقہے لگاتی، وہ ان ڈور سرگرمیوں کا شوقین اور آسیہ گھومنے پھرنے کی دل دار شخصیتوں کا اتنا تضاد ہونے کے باوجود بھی ازلان اندر سے ایک بار مطمئن ہو گیا تھا، نہیں جانتا تھا؟ وہ بھی آسیہ کی پاگل کردینے والی چاہت، حد سے بڑھا ہوا جنون، اس کی دیوانگی، وہ حقیقتاً اس پر جان چھڑکتی تھی، اسے ہاسپٹل جانے کے لیے تیار ہونے میں مدد دیتی اس کے کف لکنس خود بند کرتی، اسے کوٹ پہنانا، وہ جھنجھلا جاتا، اسے روکنا پاتا تھا، مگر جانتا تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی بلکہ الٹا اسے دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرے گی، اس لیے بحث سے بچنے کی خاطر خاموشی اختیار کر لیتا۔

ازلان کا کھانا، ناشتہ، چائے، کافی، سونے جاگنے کے اوقات، جم جانے کی ٹائمنگ اسے سب یاد رہتے، ہر چیز ازلان کو بروقت تیار ملتی، اسے حیرت ہوتی، ایسا کیا ہے؟ ایسا کیا ہے؟ مجھ میں آخر؟ کیوں کرتی ہے اتنی محبت؟ ایک احساس جرم اسے اندر ہی اندر پکٹنیاں کاٹنے لگتا، وہ جانتا تھا کہ وہ آسیہ سے محبت نہیں کرتا، شاید کبھی نہیں سکتا، اسے محبت کرنا آتی ہی نہیں۔

اپنے اس گلٹ کو مٹانے کی خاطر وہ اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کر کے لاتا، مہنگے ترین پاکستانی بوتیک سے کپڑے سینڈلز، اس کی جیولری، چوڑیاں۔ وہ اس سے ملی ہوئی چیز کو پا کر نہال ہو جاتی، ہر وقت چوڑیاں کھدکاتی پھرتی، ہمیشہ پاکستانی سٹائل کے شلو اور قمیض میں نظر آتی، باوجود اس کے کہ اس نے اس طرح کی ڈریسنگ کبھی زندگی بھر نہ کی تھی۔

دروازے پر بیل ہوئی وہ جیسے کہکشاؤں پر چلتی ہوئی آئی، دروازہ کھولا تو

سامنے ازلان کھڑا تھا، اس کے رگ و پے میں ایک انجانی سی خوشی دوڑ گئی، سر کو ہلکا سا خم دے کر سلام کیا۔

”تھکے ہوئے لگ رہے ہیں، آریو آل رائیٹ؟“ وہ تشویش سے پوچھ رہی تھی، ازلان اس کی زیرک نگاہی کا قائل ہو گیا۔

”ہاں کمر میں درد ہو رہی ہے“ وہ کہتے ہوئے بیڈروم میں داخل ہو گیا، بیگ پہلے ہی آسیہ اس سے لے چکی تھی۔

”آس، میں بہت تھکا ہوا ہوں“ وہ کہتا ہوا بیڈ پر گر سا گیا، چہرے پر بے پناہ تھکان تھی، وہ تیزی سے اس کے قریب آگئی۔

”کمر میں چین کیوں ہو رہی ہے، کیا پہلے بھی کبھی ہوئی ہے؟“ وہ شوز اتارتے ہوئے پوچھ رہی تھی، لہجے میں گہری تشویش تھی۔

”ہاں کافی برس پہلے کی ہے اگر زیادہ دیر جھکنے والا کام کروں تو ہونے لگتی ہے، آج ایک سرجری غیر متوقع طور پر کرنا پڑی، ان فیکٹ وہ کیس تو ڈاکٹر ایڈورڈ کا تھا مگر ان کو ایمر جنسی میں کہیں جانا پڑ گیا اس لیے مجھے اسے آپریٹ کرنا پڑا“ آنکھیں موندے بول رہا تھا جب وہ اس کے شوز اتارنے کے بعد اس کی ٹانگیں سیدھی کرنے لگی، اسے ایزی کرنے کے بعد اسے لحاف اوڑھا دیا۔

”کیا یہ کمر درد موروثی ہے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”نہیں..... یہ..... ایک حادثے کا نتیجہ ہے“ بولتے ہوئے اس کے چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔

”کیا بہت خوفناک حادثہ تھا؟“ وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔

”ہاں بہت“ وہ آنکھیں موندے ہوئے بولا۔

”کوئی چائے، کافی یا کچھ کھانے کو لاؤں؟ کوئی پین کمر؟ مساج کر دوں؟“ وہ

ایک سانس میں پوچھ گئی۔

”نہیں میں سونا چاہتا ہوں ریسٹ کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا پلیز ویری

کاسٹڈی لائٹ آف کر دو اور مجھے تہجد سے پہلے جگا دینا، عشاء کی نماز پڑھ لوں گا۔
”اوکے“ وہ خوشگوار مسکراہٹ سمیت کہتی لائٹ آف کر کے باہر نکل گئی۔

لاؤنج کے صوفے پر گرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک شدید ترین الجھن تیر رہی تھی، بظاہر سب کچھ نارمل تھا مگر کہیں کوئی الجھن کوئی راز تھا جس کا سرا نہیں مل رہا تھا کیا؟ از لان کا رویہ اس کے ساتھ بالکل ٹھیک تھا، وہ اسے برابر ٹائم دیتا تھا اس کی کیئر کرتا تھا، مگر کبھی اس نے اپنے متعلق ایک بات نہیں پھوٹ کر دی، دو چار بار آسیہ نے پاکستان جانے کی فرمائش کی مگر وہ بہت خوبصورتی سے ٹال گیا، کبھی کبھی وہ بہت سرد مزاج لگتا، جیسے کبھی نہ بولے گا اور اس کی یہ حالت آسیہ کو رلانے کا سبب بنتی، وہ اس سے جھگڑتی کہ آپ مجھے بتاتے نہیں کیا مسئلہ ہے؟ کوئی ہسپتال کی مینشن ہے؟ کیا ہے؟ مگر وہ بہت سرد انداز میں کوئی مسئلہ نہیں ہے، کہہ کر کروٹ بدل لیتا اور ایسے میں آسیہ کو شدید غصہ آتا تھا، وہ مزید الجھتی۔

آخر آپ کچھ بتاتے کیوں نہیں؟“ جھگڑا طول پکڑنے لگتا، جواباً وہ اسے ٹھنڈے ٹھار انداز میں بولتا۔

”تم چاہتی ہو میں اس روم سے چلا جاؤ“ وہ روہانسی ہو جاتی۔

ایم سوری از لان میں تو صرف یہ چاہتی ہوں.....؟“

”تم کچھ مت چاہو، مجھے صرف سونے دو“ وہ بازو آنکھوں پر رکھ کر کروٹ بدلتا اور آسیہ کی دنیا زیروزبر ہو جاتی، اس کے بے آواز آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگتے ہیں۔

سرد ایسا کہ پگھلتا ہی نہ تھا باتوں سے

آدمی تھا کہ تراشا ہوا پتھر دیکھا

سوچتے ہوئے ساری رات گزر گئی، اڑھائی بجے الارم بجاتا تو آسیہ نے بمشکل جلتی آنکھیں کھول کر گھڑی پر نظر ڈالی اور آنکھیں ملتی ہوئے اٹھ گئی، ساری رات اس نے از لان کے متعلق سوچتے ہوئے بتا دی تھی، صوفے سے اٹھتے ہوئے اس نے الارم بند کیا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

لائٹ آن کر کے اس نے از لان پر ایک نظر ڈالی اور دل وہیں چل گیا، نگاہ بندھ گئی، قدم خود بخود اس کی طرف بڑھ گئے۔ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے بے اختیار اس کی بند آنکھوں کو نرمی سے ہاتھ کی پوروں سے چھوا، یہی آنکھیں تو تھیں جنہوں نے اسے پاگل کر دیا تھا، خود پر اس کا اختیار ختم کر دیا تھا، یوں کہ وہ سب بھول گئی، وجود، ہستی، دل و نگاہ سب اسی کا ہو گیا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھامتے ہوئے اس کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا، دل کو سرور سا آگیا یوں لگا جیسے روح تک سرشار ہو گئی ہو۔
”از لان اٹھ جائیں“ اس نے دھیمے سے پکارا، اسے پتا تھا کہ اس کی نیند کتنی ہلکی ہوتی ہے، ہلکی آواز دو تو اٹھ جاتا ہے اور حسب توقع اس نے کروٹ بدلی، اور آنکھیں کھول دیں۔

”میں کپڑے نکالتی ہوں، آپ شاور لے لیں“ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔

شاور لینے کے بعد وہ نماز پڑھنے لگا۔ وہ وہیں بیڈ پر نیم دراز اسے دیکھنے لگی، رکوع سے اٹھنے کے بعد اب وہ سجدہ کر رہا تھا وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی نماز ختم کرنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے وہ اٹھ کر اس کے ساتھ آگئی، اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر اس نے اپنی ہتھیلیاں رکھ دی، وہ چونکے بغیر اس طرح دعا مانگتا رہا، پھر اس نے کلمہ پڑھا اور ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیے یوں کہ آسیہ کی ہتھیلیاں نرمی سے اس کے چہرے کو چھو گئیں از لان نے بے اختیار اس کی ہتھیلیوں کو چوما اور جائے نماز تہہ کر کے اٹھ گیا۔

”کچھ کھلاؤ یا تمہارا شوہر نامہ رات سے بھوکا ہے“ وہ بہت معتدل سے لہجے میں بولا۔

”شوہر نامہ..... نامہ.....“ وہ انک انک کر بولی تو وہ کھلکھلا دیا، وہ یوں بہت

کم کھل کر ہنستا تھا، آسیہ کی ساتیس سیراب ہو گئیں۔

”آپ ہنس رہے ہیں“ اس نے منہ پھلایا۔

”مجھے خیال رکھنا چاہیے تھا کہ تمہاری اردو اتنی بھی امپروونٹ نہیں کہ ہر لفظ سمجھ

سکو“ وہ اسی طرح مسکرا کر بولا۔

”خیر کھانا لاؤ“ وہ موبائل پر کوئی نمبر ملا رہا تھا وہ بھی کھانا لانے اٹھ گئی، کھانا گرم کرنے کے بعد اس نے ٹرائی سیٹ کی اور کمرے میں لے آئی، وہ ابھی تک نمبر ڈائل کر رہا تھا شاید اس کا رابطہ نہیں ہوا تھا اسی لیے وہ باری باری ری ڈائل کر رہا تھا، وہ کچھ جھنجھلا گئی۔

”بعد میں کر لیجئے گا، اس وقت کس کو اتنا ضروری فون کرنا ہے؟“

”ایک دوست ہے بھئی، کافی عرصے سے آن لائن نہیں ہو رہا، نہ فون اٹھاتا ہے نہ میٹ پر بات کرتا ہے“ وہ بتا کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور فون سائیڈ پر رکھ دیا۔

”میرے ساتھ معاذ کی سخت قسم کی ناراضگی چل رہی ہے، پچھلے سات ماہ سے“ وہ بتا رہا تھا۔

”کیوں؟ ایسی کون سی بڑی بات ہے جس پر اتنی ناراضگی پیدا ہو گئی؟“ وہ حیرانی سے بولی۔

”بس وہ کہتا تھا شادی کرلو، پاکستان آ جاؤ، میں نے کہا یا تم مجھ سے تین سال بڑے ہو پہلا حق تمہارا ہے، جب تک تم شادی نہیں کرتے میں بھی نہیں کروں گا، اسی بات پر ناراضگی ہو گئی ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سخت سنائیں، اس کے بعد سے رابطہ منقطع ہے، آج سوچا اب جب کہ میں نے شادی کر لی ہے تو اسے بھی بتا دوں تاکہ اسے تو سکون ملے، ناراضگی بھی ختم ہو“ وہ بولتا ہوا ایک لمحے کو رکا، پھر فون پر کوئی اور نمبر ملانے لگا، تھوڑی دیر بعد کال مگ گئی، لقمان، احتشام کے بزنس پارٹنر تھے۔

”جی لقمان صاحب میں از لان بات کر رہا ہوں معاذ سے بات کرائیں، یہ گھر کے نمبر بھی بند ہیں اور آفس کا نمبر بھی بڑی مشکل سے ملا ہے۔ خیریت“ وہ استفسار کرنے لگا۔

”خیرت نہیں از لان“ لقمان ٹھنڈے لہجے میں بتانے لگے۔

”تمہارا آخری بار معاذ سے رابطہ کب ہوا تھا؟“

”یہی کوئی سات اٹھ ماہ پہلے“ وہ پریشان سا ہو گیا۔

”اسی لیے تم بے خبر ہو“ انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”کک..... کیا بات ہے، سب ٹھیک ہے نا“ اس کا دل انجانے خدشوں سے لرز اٹھا۔

”سب ٹھیک نہیں ہے، آج سے ساڑھے سات ماہ پہلے احتشام کی پوری فیملی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں معاذ بھی چل بسا، بس جو خدا کی مرضی“ انہوں نے اسے تسلی دی۔

از لان کے سر میں دھماکے سے ہونے لگے، اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے، پھر فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، وہ یک ٹک خلاف میں گھور رہا تھا۔

کتنی مغرور ہے خوشی ملنے جاؤ تو نہیں ملتی

کتنا ملنسار ہے غم ہمیشہ خود سے آ کر ملتا ہے

اس کے ذہن میں آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں، صدائیں شور مچانے لگیں بچپن کی یادیں۔

”معاذ پاپا مجھ سے پیار نہیں کرتے“

”ایسا مت سوچو از لان وہ تمہارے پاپا ہیں“

”معاذ پاپا نے مجھے تھپڑ مارا، وہ کہتے ہیں تم نے مجھے بگاڑ دیا ہے“

”انہوں نے تمہارے لیے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے از لان، تمہیں اسی سکول

میں جانا چاہیے جس میں وہ چاہتے ہیں“

”معاذ پاپا مجھے لندن بھیج رہے ہیں“ وہ روتے ہوئے بتا رہا تھا جواب میں

اس کی ڈھیروں تسلیاں۔

”از لان یا تو شادی کر لے ورنہ تیری میرے سے کچی لڑائی ہے“

”تو خود کیوں نہیں کرتا“ وہ جھنجھلا جاتا۔

”از لان اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو میں تجھ سے کبھی بات نہیں کروں گا“

اور وہ چلا گیا اپنی تمام تر ظاہری اور باطنی خوبصورتی کے ساتھ اتنی دور جہاں سے واپسی ناممکن تھی، از لان میکا کی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا، اس کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے، وہ سیدھا اسٹڈی میں جا کر بند ہو گیا۔

کالج سے لے کر یونیورسٹی تک صرف تین لوگ ہی ان کے معیار پر پورے اترے تھے۔

سب سے پہلے احتشام جو کہ ان کے کالج فیلو تھے، اگرچہ بعد میں فیلڈر الگ ہو گئیں، سکندر نے میڈیکل چوز کیا اور احتشام بزنس کی طرف چلا گیا، مگر یہ دوستی قائم رہی تھی، دوسرے نمبر پر ایاز تھے، ایاز ان کے کالج فیلو تھے مگر چونکہ ایاز نے بھی میڈیکل کی لائن چنی تھی اس لیے وہ دوستی بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ سکندر نے انہیں اپنے ہاسپٹل میں پائرٹرن بنالیا خیر یہ تو بہت بعد کی بات تھی، لیکن یونیورسٹی میں جو ہستی ان کی نگاہ کو بھائی وہ حقیقتاً اس قدر خاص اور نایاب تھی کہ سکندر نے اسے اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا۔

”شازمہ احسن“

حسن سیرت اور حسن صورت دونوں میں یکتا۔

سب سے خاص چیز اس کے چہرے پر سچی سیاہ آنکھیں تھیں ہیروں کی مانند جگر جگر آنکھیں، جنہوں نے حقیقتاً سکندر کو پاگل کر دیا، انہیں شازمہ احسن کے سوا کچھ سوچتا ہی نہ تھا، یونیورسٹی میں ان کا آخری سال تھا، اس کے بعد دو سال کا ہاؤس جاب، لیکن انہیں یہ انتظار گوارہ نہ تھا، وہ فوری طور پر شازمہ سے شادی کرنا چاہتے تھے اور وہ کوئی غریب آدمی تو تھے نہیں کہ بیروں پر کھڑے ہونے کا انتظار کرتے، کیونکہ حیات گردیزی نے اپنی زندگی میں ہی جائیداد دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم کر دی تھی اور اپنے اپنے حصے کی جائیداد اور فیکٹریاں وہ خود سنبھالتے تھے، سکندر حیات کے حصے میں دو فیکٹریاں، گلاس مل، پلازہ اور گاؤں میں موجود جائیداد آئی تھی، جبکہ مظہر حیات نے الیکٹرونکس اور گاڑیوں کے کاروبار کو پسند کیا تھا۔

اس لیے انہوں نے حیات گردیزی اور فاخرہ گردیزی سے اپنی شادی کے متعلق بات کی اور جیسا کہ انہیں توقع تھی مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

مگر وہ بھی سکندر تھے، اپنی زندگی کا ہر فیصلہ انہوں نے خود کیا تھا، کپڑوں کے انتخاب سے لے کر مضامین کے انتخاب تک، ہر فیصلہ وہ خود کرتے اور اب تو ان کی

وہ بری طرح دروازہ پیٹ رہی تھی۔

”ازلان کچھ تو بتائیں کیا بات ہے، ازلان دروازہ کھولیں“

مگر بے سود

☆☆☆

حیات گردیزی کے دو بیٹے تھے، مظہر حیات گردیزی اور سکندر حیات گردیزی، حیات گردیزی جدی پشتی جاگیر دار تھے، شہر میں ان کی کئی فیکٹریاں، شوگر ملز اور رائس ملز تھیں۔

مظہر حیات میٹرک کے بعد باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے جبکہ سکندر مزید پڑھنے کے لیے شہر آ گئے، کالج سے یونیورسٹی جانے کی منازل انہوں نے خالص سلجھے اور ستھرے انداز میں طے کیں اور ادھر ادھر افیئر وغیرہ میں ملوث ہونے سے گریز کیا، اگرچہ انہیں قدم قدم پر ان کی بے پناہ وجاہت اور خوبصورتی کا احساس دلایا گیا، مگر یہ تعریف و توصیف انہیں نئی نہیں لگتی تھی، وہ بچپن سے اس کے عادی تھے، اس سے متاثر نہ ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے ارد گرد خوبصورتی دیکھی تھی، یہ خوبصورتی، سرخ و سفید رنگت اونچا لمبا دراز سراپا وراثت میں تھا، ان کا پورا خاندان خوبصورتی میں یکتا تھا، ہر کوئی ایک سے بڑھ کر ایک تھا، اس خوبصورت ماحول میں رہتے ہوئے اگر سکندر حیات مغرور نہ ہوتے تو حیرت کی بات ہوتی، ان کے چہرے پر ایک فطری تمکنت اور نقوش میں ایک منفرد قسم کا غرور تھا، کہ جو ملتا اسیر ہو جاتا خود سکندر حیات ایک بے حد حسن پرست انسان تھے، انہیں بد صورتی سے چڑھتی تھی، وہ مقابل میں حسن تلاش، اس کے چہرے میں اس کی آواز میں، اس کے لہجے میں، اس کے پہناوے میں، اس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں انہیں ہر حال میں اس خوبصورتی کی طلب ہوتی تھی، پھر ہی وہ مقابل سے اطمینان سے بات کر سکتے تھے، ورنہ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتے۔ وہ کسی نہ کسی چیز (خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ) میں حسن تلاش کرتے اور اگر انہیں نہ ملتا تو پھر تعلقات کی ڈوروں میں ٹوٹ جاتی۔

نتھی نہ کوئی خلا۔

شازمہ ہر لحاظ سے ایک پرفیکٹ چوائس تھی، وہ انہیں بہت اچھی طرح سمجھتی تھی ان کے چہرے سے دل کا حال بتا دیتی سکندر خوشی سے پھولے نہ ساتے انہیں اپنی چوائس پر ناز ہوتا زندگی بہت متوازن انداز میں گزر رہی تھی ان کے ہاسپٹل کا آغاز ہو چکا تھا اور محض چھ ماہ میں ہی ان کا ہاسپٹل شہر کے مہنگے ترین ہسپتالوں میں شمار ہوتا تھا ڈاکٹر ایاز ان کے پارٹنر تھے، احتشام سے بھی ملاقات رہتی احتشام کا صرف ایک بیٹا تھا، سکندر کو اسے دیکھ کر بیٹے کی خواہش ہوتی، وہ تھا ہی اتنا پیارا اور خوبصورت کہ ہر ایک اسے پیار کرتا۔

”احتشام کا بیٹا دیکھا ہے نا تم نے شازمہ کتنا پیارا ہے، میرا دل چاہتا ہے ہمارا بیٹا بھی ایسا ہی ہو“ وہ جوش سے کہتے تو ایک لمحے کو شازمہ ٹھٹھک جاتیں۔

”سکندر اگر ہمارا بیٹا اتنا خوبصورت نہ ہوا تو؟“ وہ دل میں ڈھیروں خدشات لیے پوچھتیں، جانتی تھیں کہ وہ کس قدر حسن پرست طبیعت رکھتے تھے کہ نوکر بھی دیکھ بھال کر رکھتے تھے، شاید یہ حسن و خوبصورتی کے بیچ گھرا رہنا ان کی نفسیاتی کمزوری بن چکا تھا۔

”کیوں خوبصورت نہیں ہوگا بھی، آخر اس کے پیئر اس اتنے خوبصورت ہیں“ وہ غرور سے کہتے تو ایک لمحے کو وہ ان کا تکبر دیکھ کر ہول جاتیں۔

وقت تیزی سے بیتا، وہ دسمبر کا دوسرا ہفتہ تھا جب شازمہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا ان کا کیس بے حد کمپلیکڈ ڈنٹھا، بمشکل بچہ تو بچ گیا مگر شازمہ زندگی کی بازی ہار گئیں، وہ ایک بے حد طوفانی رات تھی، طوفان، گرد و غبار ہر طرف تھا، ہواؤں کے طوفانی جھکڑیوں چل رہے تھے جیسے ہر چیز اڑا کر لے جائیں گے، کون سا بچہ کہاں کا بچہ؟ سب بھول گیا انہیں یاد تھا تو صرف اتنا کہ اکیس دسمبر ان کی زندگی کا سب سے منحوس دن تھا جس نے ان سے ان کی کل کائنات چھین لی تھی، ان کی شازمہ چھین لی تھی انہیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کریں؟ کس کے کندھے پر سر رکھ کر روئیں، کس کو اپنا دکھ سنائیں؟ کیسی زندگی تھی اب تک؟ ایک خوبصورت اور پھول دار سیڑھی تھی جس پر وہ قدم بہ قدم اوپر کو جا رہے تھے، پھولوں کی خوشبو مست خرام تھی، اس خمار میں انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب سیڑھی

زندگی کا معاملہ تھا وہ کیسے پیچھے ہٹ جاتے، اس لیے انہوں نے کسی قسم کی مخالفت کو درخواتنا نہ جانا، ہمیشہ کی طرح اپنا فیصلہ سنایا اور حویلی سے چلے آئے، کہ ”اگر کوئی ان کی خوشی میں شریک ہوا تو ٹھیک ورنہ شادی تو انہیں ہر حال میں شازمہ سے ہی کرنی ہے، ماں باپ کے بغیر ہی سہی، وہ یہ فرض کر لیں گے کہ ان کا کوئی نہیں ہے“

مظہر حیات گردیزی کو سکندر کے الفاظ نے اتنا غصہ اور طیش دلایا تھا کہ انہوں نے سکندر سے ہر قسم کا تعلق ختم کر لیا اور عہد کیا کہ وہ اور ان کی آئندہ نسلیں سکندر کی شکل تک نہ دیکھیں، مگر حیات گردیزی ایسا نہیں کر سکتے تھے وہ باپ تھے اور مظہر بھائی اس لیے بچے دل کے ساتھ ہی وہ اور فاخرہ شہر گئے تھے، شادی کی تیاریاں کیں تھیں، شادی کے اختتام پر وہ گاؤں لوٹ آئے، شادی کے دوران جب سکندر نے مظہر کے متعلق پوچھا تو ابامیاں نے اسے مظہر کا فیصلہ صاف صاف بتا دیا، سکندر ایک لمحے کو خاموش ہوئے تھے، مگر جلد ہی سنبھل کر خود پر قابو پالیا، وہ عمر اور کامیابی کی اس اسٹیج پر تھے جہاں اس قسم کی ناراضگیاں ان کے لیے قطعی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔

شازمہ سے شادی کے ایک سال بعد ابامیاں (حیات گردیزی) وفات پا گئے اور اماں بی (فاخرہ گردیزی) نے ان کا غم ایسا دل کو لگا لیا کہ چھ ماہ سے زیادہ نہ جی سکیں۔

یوں سکندر جو کہ اماں بی کی خاطر مہینوں بعد حویلی کا چکر لگا لیتے تھے، اب حویلی سے بالکل ہی کنارہ کش ہو گئے، مظہر حیات سے ان کے تعلقات پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔

شازمہ احسن سے شادی کے تیسرے سال بعد انہیں زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری ملی، کس قدر خوش تھے وہ اپنے اور شازمہ کے بچے کا تصور ہی اس قدر فرحت انگیز تھا کہ قدم زمین پر نہ پڑتے تھے۔

اسی ماہ ان کے ہاسپٹل کی تعمیر مکمل ہوئی یہ ان کا بہت پرانا خواب تھا کہ وہ ہاؤس جاب کے بعد ہاسپٹل بنائیں گے، پیسہ ان کے پاس بے شمار تھا جو کہ خوابوں کو تکمیل تک لانے کا معاون بنتا ہے، اسی لیے ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

زندگی ہر لحاظ سے مکمل تھی، ہر طرف خوشیاں تھیں، کامیابیاں تھی کہیں کوئی کمی

سلیب کے کناروں کو سختی سے پکڑتے ہوئے اس نے اپنے آتمیش آنسوؤں کو بننے دیا کہ دل میں اس بات کا خوف تھا اگر یہ آنسو آج نہ گرے تو دل کی شاداب زمین کو کائی زدہ کر دیں گے اور پھر بنجر اور اسے بنجر آبادیوں سے ڈر لگتا تھا۔

جلتے دل کے ساتھ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور مارتی چلی گئی۔
 ”دروازہ بند کرلو“ پیچھے سے ازلان کا ٹھنڈا لہجہ اسے اندر تک چیر گیا، وہ خود پر ضبط کے پہرے بٹھاتی، مڑی اور اس کے پیچھے چلنے لگی بنا اس کی طرف دیکھے وہ دروازے سے نکل کر وہ کار تک گیا اور سیٹ پر بیٹھ کر کار سٹارٹ کی اور یہ جاوہ جا، یہ جانے بغیر کہ اڑتی خاک میں آسیہ کا دل بھی اس طرح غبار آلود ہو گیا تھا۔

☆☆☆

چار دن بعد وہ گھر آئے تھے ہر طرف اسی کی یادیں تھیں قد آور تصویریں پورے گھر میں آویزاں تھیں، وہ ساکت سے چند لمحے تک اپنی اور شازمہ کی شادی کی تصاویر دیکھتے رہے اور پھر جیسے وحشت اندر تک بھر گئی، یکنخت احساس ہوا یہ پری پیکر، شاداب، زندگی اور روشنی سے سجاد وجود ہمیشہ کے لیے منوٹی مل چلا گیا، انہوں نے ساری تصاویر اتارنا شروع کر دیں، چند منٹوں میں سارا گھر صاف ہو گیا تھا باہر لان میں جا کر انہوں نے ان تصاویر کو آگ دکھادی، سب کچھ جلنے کے بعد وہ جلی ہوئی راکھ دیکھتے رہے اور دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے پھر وہ دل جس میں شازمہ بہت مضبوطی سے براجمان تھی کسی ملکہ کی مانند، کسی دیوی کی مانند۔

پھر کسی روبوٹ کی مانند چلتے ہوئے لاؤنچ میں آئے اور صوفے پر گر گئے، آنکھیں موند کر رگ رگ میں اترتی اذیت کو کم کرنے کی کوشش کی تھی، اسی دوران نور بی بی ہاتھوں میں بچہ اٹھائے چلی آئیں، نور بی بی ان کی خاندانی ملازمہ تھیں، وہ شازمہ اور سکندر کی شادی پر حیات گردیزی کے ساتھ آئیں تھیں۔ پھر فاخرہ کے حکم پر ہمیشہ کے لیے یہیں کی ہو گئیں، شازمہ سے انہیں بے حد پیار تھا اور اس کی موت پر وہ ایک ماں کی طرح ہی افسردہ تھیں۔

کے آخری سٹیپ پر پہنچے؟ اور پھر؟ یک لخت کسی نے جھٹکے سے سیڑھی الٹی اور وہ ساتویں آسمان سے نیچے گر پڑے وہ تو صرف روشنیوں کے ہمسفر تھے، یہ کس نے انہیں اندھیروں کا باسی بنادیا اور اندھیرے بھی ایسے کہ ان کی ذات شناخت مان اور غرور سب گم ہو گیا تھا۔
 یہ اندھیرے انہیں پاگل کر رہے تھے، ساکت ہوتے ذہن و دل پر اس فقرے کی تلخی زندگی بھر کے لیے ثبت ہو گئی۔

”شازمہ اڑ ڈیڈ“

☆☆☆

اس نے ناشتے کے برتن سلیب پر پٹخے اور اپنے گرم گرم نکلنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی، تلخی اس کی نس نس میں بس رہی تھی ایک زہر تھا جو رگ و پے کو نیلا کر رہا تھا۔

ہر کوشش ناکام تھی اس کی ہر کوشش اس شخص کو بدلنے کی ہر کوشش یکسر ناکام تھی، وہ اپنی ناکامی پر جھنجھلا رہی تھی، سرخ رہی تھی رو رہی تھی یوں جیسے کوئی بچہ اپنے سے شاطر شخص کے ساتھ کھیلتا ہے، ہارتا ہے اور روتا ہے، جیتنے کی کوشش کرتا ہے مگر جیت نہیں پاتا۔
 اور ازلان سکندر کو جیتنا تو بہت دور کی بات تھی وہ تو اسے سمجھ بھی نہیں پارہی تھی، کتنا سرد تھا وہ؟ کتنا سنگدل؟ یوں جیسے اس کے سینے میں دل نہ ہو پتھر ہو، وہ اس تک آنے کی اسے سمجھنے کی ہر کوشش کر چکی تھی اور ناکام تھی اور یہ ناکامی اسے رلا رہی تھی۔

جانے کیسا اسرار تھا اس شخص کی ذات میں؟ کیسا طلسم کہ وہ جکڑی گئی تھی جیسے کسی تار عنکبوت میں پھنسی مکھی، وہ آزاد نہیں ہو پارہی تھی، اس کے سحر سے نکل نہیں پارہی تھی، پانچ ماہ ہو چکے تھے شادی کو اور وہ اس کو صرف اتنا ہی سمجھ پائی تھی کہ اس کی ذات پر بے تحاشا خول چڑھے ہیں خول درخول ہر روپ نیا ہر رنگ نیا، ہر اسلوب نیا اور آسیہ ازلان کو ایک بات کا یقین تو ہو چکا کہ وہ کبھی بھی ازلان کو سمجھ نہیں پائے گی وہ بھیدوں بھرا شخص جس کی سیاہ آنکھوں میں ڈھیروں کہانیاں چھپی تھیں، ہمیشہ اس کے لیے اجنبی ہی رہے گا، داستانیں ان کہی رہ جائیں گی۔

”بی بی جان میں پایا کا بیٹا نہیں ہوں ناں“ اس کا لہجہ کس سچائی کی کھوج میں لگا رہا تھا۔

نور بی بی کا دل دھک سے رہ گیا، کیا تھی اس کی عمر، صرف گیارہ سال اتنی گہری سوچ، انہوں نے تڑپ کے اسے سینے سے لگا لیا۔

”ازلان میرے بچے اتنی بڑی بات کیسے سوچی تم نے؟ وہ تمہارا باپ ہے سگا باپ کبھی ایسی بات مت سوچنا“ وہ اسے سمجھانے لگیں۔

”آپ کو پتا ہے بی بی جان آج دوپہر میں کیا ہوا“ پاپا لہجے کرنے گھر آئے تھے اور جب بانوں (ملازمہ) نے مجھے ٹیبل پر بلایا، میں کھانا کھانے آیا تو وہ اٹھ کر چلے گئے، انہوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں میں نے تو انہیں سلام بھی کیا تھا“ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”وہ بہت مصروف رہتے ہیں بیٹے، انہیں کوئی کام ہوگا“ وہ پھر سے اسے بہلانے لگیں۔

”نہیں بی بی جان مجھے جھوٹی تسلیاں مت دیں یہ سارے کام انہیں مجھے دیکھ کر ہی کیوں یاد آتے ہیں“ پر شکوہ لہجہ۔

”اگر میں ان کا بیٹا ہوں تو کبھی میرے پاس کیوں نہیں بیٹھتے، کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی، کبھی مجھے پیار کیوں نہیں کیا“ وہ سسک اٹھا باپ کی بے اعتنائی، ماں سے محرومی نے اسے وقت سے پہلے میچور کر دیا تھا اس کا ذہن وہ بات سوچتا جو عمو پچیس تیس سال کا آدمی سوچتا ہے یہ ذہانت فطری تھی، وہ بہت جینٹل تھا، ہمیشہ اس کے رپورٹ کارڈ پر فرسٹ پوزیشن ہوتی شاید اپنی حساسیت کی بنا پر وہ رویے بہت جلد محسوس کرتا تھا اور سکندر حیات کا رویہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا اور اب پہلی بار نور بی بی کو احساس ہوا کہ وہ کتنی بھی کوشش کر لیں ماں باپ کی کمی کو پورا نہیں کر سکتیں۔

وہ اسے اپنے ساتھ لگائے گھر کے اندر لے آئیں، وہ آنکھیں صاف کر کے سونے چلا گیا۔

”آپ نے ابھی تک ازلان میاں کو نہیں دیکھا صاحب“ نور بی بی کی آواز پر انہوں نے اپنی جلتی آنکھیں کھولیں اور دل میں بے ساختہ اسے اٹھانے کی خواہش ہوئی، میرا بیٹا، انہوں نے اپنے اندر چھپی ویرانیوں میں سے خوشی تلاش کی چاہی اور ایک ننھی سی کرن کو تھامنے میں کامیاب ہو گئے۔

بے اختیار ان کے ہاتھ واہوئے اور انہوں نے اسے گود میں لے لیا، نگاہوں نے بے تابی سے چہرے کو دیکھا اور پھر انہیں یوں لگا کہ کسی نے انہیں جلتی ہوئی بھٹی میں پھینک دیا ہو، انہوں نے ناقابل یقین نظروں سے بچہ دیکھا، آنکھیں ماننے سے انکاری تھیں، سانولی رنگت بھدے نقوش بڑی بڑی پھیلی ہوئی ساہ آنکھیں اور سب سے کریمہ چیز جو انہیں لگی اس کی پیشانی سے کان تک پھیلا ہوا وہ سیاہ چاند، ان کے اندر تک کراہت اور نفرت کا زہر پھیلتا چلا گیا۔

”یہ..... یہ..... میرا بیٹا نہیں ہے، یہ میرا بیٹا نہیں..... ہو سکتا“ انہوں نے پھینکنے والے انداز میں نور بی بی کو تھما دیا۔

”اور اس کو ازلان کیوں کہا آپ نے؟ وہ شازمہ کے بچے کا نام تھا جو اس نے سوچا تھا اور یہ..... یہ ہمارا بیٹا نہیں..... یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے اتنا..... اتنا بد صورت بیٹا نہیں ہو سکتا میرا..... بالکل نہیں..... یہ میرا بیٹا نہیں ہے“ وہ ہذیانی انداز میں چلا رہے تھے اور ننھا ازلان جیسے احتجاج کرتے ہوئے زور زور سے رونے لگا اور یہ تو صرف آغاز تھا انہوں نے حقیقتاً بھی اسے اپنا بیٹا نہ مانا، وقت گزرتا رہا، وہ ان کی بے توجہی سہتے سہتے عمر کی کئی منزلیں طے کرتا یہاں تک آپہنچا کہ ذہن میں اٹھتے سوال جواب مانگنے لگے۔

لان میں لگے جھولے پہ بیٹھا وہ کب سے پودوں اور درختوں کو دیکھ رہا تھا رات بتدریج ٹھنڈی اور گہری ہوتی جا رہی تھی اور وہ جیسے ہر احساس سے بے نیاز تھا، نور بی بی اسے ڈھونڈتے ہوئے چلی آئیں۔

”ازلان بیٹے کب سے بیٹھے ہو یہاں، اب اٹھو دیکھو سردی بڑھ رہی ہے“ وہ نرمی سے اس کے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔

نور بی بی اسے دودھ کا گلاس دینے آئیں تھیں وہ باتھ روم سے ڈھیلا ڈھیلا نائٹ ڈریس پہن کر نکلا، تو انہیں موجود پایا، دودھ کا گلاس لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا، گھونٹ گھونٹ پینے کے بعد وہ اوندھا لیٹ گیا، انہوں نے دراز سے تیل کی شیشی نکالی اور اس کے شارٹس کو تھوڑا اوپر کر دیا پھر اس کی ٹانگوں اور پیروں کا مساج کرنے لگیں یہ اس کی عادت تھی اس کے بغیر اسے نیند نہ آتی، مالش کرنے کے بعد وہ اس کی ٹانگیں دبائے لگیں۔

”آج تو میرا بیٹا بڑا خوش ہے“

”جی بی بی جان معاذ بہت اچھا ہے“ وہ نیند میں مسکرا کر بولا۔

انہوں نے محبت سے ان کے بال سنوارے اور لائٹ بجھا کر باہر نکل آئیں۔ اس کا فٹھ اسٹینڈرڈ کا رزلٹ آیا تو سکندر نے اس کا سکول بدل دیا، نور بی بی، ازلان اور معاذ تینوں کو ہی سخت شک لگا تھا معاذ تو صبر کر کے بیٹھ رہا کہ جانتا تھا احتشام صاحب کے پاس اتنے وسائل نہیں کہ وہ اسے اتنے مہنگے سکول میں تعلیم دلوا سکیں، نور بی بی مطمئن تھیں کہ صد شکر سکندر نے ازلان کا کوئی فیصلہ تو خود کیا اور ازلان وہ سخت دلبرداشتہ سان کے پاس آیا تھا۔

”بی بی جان مجھے اس سکول میں نہیں پڑھنا آپ پاپا سے بات کریں“ وہ

ضدی لہجے میں بولا۔

”بیٹا لیکن مسئلہ کیا ہے یہ سکول؟ اچھا ہے“ وہ اسے چمکارتے ہوئے بولیں۔

”لیکن یہاں معاذ تو نہیں ہے نا“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا جواباً وہ اسے

دھیرے دھیرے نرمی سے کچھ سمجھانے لگیں لیکن وہ سمجھنے کے موڈ میں تھا کہاں۔

”میں خود بات کرتا ہوں پاپا سے“ وہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا وہ ہول کر

رہ گئیں۔

اس نے آہستگی سے دروازے پر دستک دی اور لیس کی آواز سن کر اندر داخل ہو گیا۔

بیڈ پر نیم دراز سکندر کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے، انہوں نے قدرے

حیرت سے اسے دیکھا۔

اگلے روز اتوار تھا، وہ ناشتہ کرنے کے بعد ڈرائنگ روم آیا تو سکندر کے ساتھ احتشام انکل کو پایا، ست قدموں سے چلتا وہ ان تک آیا۔

”اسلام وعلیکم پاپا، السلام علیکم انکل“ اس نے سلام کیا سکندر نے کوئی نوٹس نہ لیا جبکہ احتشام صاحب نے جواب دے کر اس کے سر پر پیار دیا۔

”گڈ مارننگ ازلان“ اسے پیچھے سے معاذ کی آواز آئی، وہ بنے ساختہ مڑا اور معاذ کو دیکھ کر اس کے اندر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

”کیسے ہو معاذ“ وہ اس سے ملنے لگا ساتھ ہی حرا بھی موجود تھی، پنک فرائک میں اپنے لمبے بالوں کی پونیاں بنائے پانچ سالہ حرا، معاذ کی چھوٹی بہن تھی، ازلان نے بے ساختہ اس کے گال پر پیار کیا۔

”کیسی ہو حرا؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”آپ کیسے ہیں؟“ وہ الٹا پوچھنے لگی وہ ہنس پڑا۔

”آئم فائن“ وہ مسکرا کر بولا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں“ وہ ناک چڑھا کر بولی، وہ ایسی ہی تھی بے حد کم گو اور سنجیدہ بچوں والی تو کوئی بات ہی نہ تھی بس ازلان سے خصوصی طور پر بنتی تھی اور ازلان کو بھی سنہری آنکھوں اور لمبے سنہرے بالوں والی حرا بے حد پسند تھی وہ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی ہی اتنی پیاری تھی۔

معاذ، ازلان سے تین سال بڑا تھا، چونکہ وہ دونوں ایک سکول میں تھے اس لیے دوستی تھی سکندر نے تو ازلان کی کسی چیز میں دلچسپی نہ لی تھی خود نور بی بی نے اسے معاذ کے سکول ڈالا تھا حالانکہ وہ سکول ان کے لیونک اسٹینڈرڈ سے میچ نہیں کرتا تھا مگر انہوں نے اسے اس لیے اس سکول میں بھیجا تھا کہ معاذ ان کا دھیان رکھ سکے سکول اگر اتنا اچھا نہیں تو برا بھی نہیں تھا اور معاذ اور ازلان کی دوستی انہیں اندر سے مطمئن کر گئی تھی۔ وہ سنڈے ازلان کی زندگی کا شاندار دن تھا وہ اور معاذ آدھا دن ہاکی کھیلتے رہے، ہاکی دونوں کا پسندیدہ کھیل تھا ایک بھر پور دن گزار کر معاذ اور حرا چلے گئے رات کو

”السلام علیکم پاپا“ دھیرے سے نظریں جھکائے اسے سلام کرتے دیکھ کر وہ شاکد سے رہ گئے، وہ پہلی بار ان کے کمرے میں آیا تھا۔

”تم؟ کیا بات ہے؟“ سرد اور کھر دار لہجہ، وہ کنفیوز ہو گیا، لیکن حوصلہ مجتمع کر کے بول پڑا۔

”مجھے اس سکول میں نہیں پڑھنا“ وہ خود سری سے بولا ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اگلے ہی لمحے وہ ہوش میں آگئے چند سیکنڈ لگے تھے انہیں بستر سے اٹھ کر اس کے مقابل آنے میں۔

”مجھے تمہاری کسی بات سے دلچسپی نہیں کہ تمہیں کہاں پڑھنا ہے اور کہاں نہیں، یہ میرا فیصلہ ہے جو تمہیں ہر حال میں قبول کرنا ہوگا“ انہوں نے بات ختم کر کے اسے دروازے کا راستہ دکھایا اور شدید ترین احساس ذلت میں دھنستے ہوئے از لان لحوں میں سارا خوف جھک اور کنفیوژن بھول گیا۔

”میں آپ سے کہہ رہا ہوں پاپا مجھے یہاں نہیں پڑھنا“ قطعیت بھرا لہجہ گستاخی لیے ہوئے تھے۔

سکندر جیسے جلتی بھٹی میں جا پڑے، بے اختیار اٹے ہاتھ کا طمانچہ اس کے گال پر پڑا۔

”جیسا میں نے کہا ہے تم صرف ویسا ہی کرو گے اور اب اپنی یہ منحوس صورت لے کر دفع ہو جاؤ گیٹ لاسٹ“ وہ حلق کے بل دھاڑے۔

وہ گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا پھر دوڑتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

وہ کب سے یونہی سڑکوں پر گھوم رہی تھی دل کو کسی پل قرار نہ تھا ایک بے چینی جو جسم و جاں پر حاوی ہوتی جا رہی تھی، از لان کا رویہ بالکل سمجھ میں آنے والا نہ تھا، ابتدائی ڈیڑھ دو ماہ جس توجہ اور کیئر کو زبردستی آسیہ نے حق سمجھ کر وصول کیا تھا اس کا اب

کہیں نام و نشان نظر نہ آتا ہے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ ندی کے دو کناروں کی مانند تھے حالانکہ وہ اسی طرح اس کا خیال رکھتی کھانا بناتی، کپڑے پر لیس کرتی، لیکن جانے از لان اتنا روڈ اور کول ہو گیا تھا، بلکہ شاید وہ تھا ہی ایسا آسیہ نے ہی اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی اور غلطی اب ناقابل تلافی ہوتی جا رہی تھی۔

یونہی چلتے چلے اسے اولڈ پبلک لائبریری کا بورڈ نظر آیا وہ بے اختیار اندر چلی گئی۔ کاؤنٹر کے پیچھے جوزف موجود تھا اسے آتے دیکھ کر وہ حیرانگی سے کھڑا ہو گیا۔

”اے آسیہ تم..... یوں اچانک..... کیسی ہو؟“ وہ پرست لہجہ میں بولا، وہ آہستگی سے کاؤنٹر کے آگے بڑے سٹول پر ٹک گئی۔

”میں ٹھیک ہوں“

”تمہاری انڈین دوست گیتا نے مجھے بتایا کہ تمہیں کسی سے محبت ہو گئی اور تم نے شادی کر لی ہے کیا ہے تمہارا رائٹ مین؟ ملو او کی نہیں“ وہ تیز تیز بولتا ہوا دوسری طرف ٹک گیا۔

”وہ بالکل اچھا نہیں ہے جوزف“ کاؤنٹر پر کہنیاں رکھتے ہوئے اس نے سردنوں ہاتھوں پر گر لیا۔

”لیکن کیوں؟ وہ تو مسلم ہے نا“ وہ حیرانگی سے پوچھ بیٹھا۔

”ہاں وہ مسلم ہے پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے ڈرنک نہیں کرتا، اسموکنگ نہیں کرتا، بارز میں نہیں جاتا ہے کسی لڑکی سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ مسلم ہے نا“ کیا تھا اس کے لہجہ میں؟ طنز کاٹ، استہزایہ کیا؟ وہ جان نہیں سکا۔

”اگر وہ اتنا اچھا ہے تم خوش کیوں نہیں ہو؟“ وہ الجھ گیا۔

”کیوں کہ اسے یاد ہی نہیں میں اس کی بیوی ہوں، وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا جوزف“ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر کاؤنٹر پر گر گئے۔

”کیا وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس نے تم سے کیوں شادی کی؟“ وہ کچھ اشتعال سے پوچھنے لگا۔

”وہ کسی سے پیار بھی نہیں کرتا، اسے محبت کرنا نہیں آتی، پتا نہیں کون سی نفسیاتی پر اہلم ہے اس کے ساتھ، بتاتا بھی نہیں“ وہ رونے لگی، وہ تاسف سے اسے دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر اس نے اسے پانی کا گلاس تھمایا، چند لمحوں بعد وہ خود پر قابو پا کر اٹھ گئی۔

”میں تمہارے لیے کرائسٹ سے دعا کروں گا بے بی یو ڈونٹ وری“ جوزف نے اس کا سر تھپتھپایا تو وہ سر ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اور پھر از لان کی زندگی میں ویسا ہی ہوا جیسا سکندر نے چاہا تھا، اسے ”جی سی گرائمر“ میں داخلہ مل گیا اسے ہر قسم کے دوست ملے اگر وہ دلچسپی لیتا تو مگر اس نے کبھی دوست نہیں بنائے سکندر حیات کا بھوت سر سے اترتا تو کچھ یاد آتا، البتہ اسے گیمز میں دلچسپی تھی اور صرف یہی ایک موضوع تھا جس پر وہ اپنے کلاس فیلوز سے ڈکشن کرتا، رفتہ رفتہ وہ سیٹ ہوتا گیا، پھر اسے سکول کی ہاکی ٹیم میں شامل کر لیا گیا اور اسی سال اس کے اندر ایک اور شوق جڑ پکڑ گیا۔

”پینٹنگ“

سب سے پہلے اس نے اپنے کمرے کا اسٹچ بنایا اور وہ اس قدر مکمل اور شاندار تھا کہ ایک لمحے کو وہ گنگ رہ گیا تھا، اس کی زندگی اب صرف دو چیزوں کے گرد گھومنے لگی۔

”ہاکی اور پینٹنگ“

معاذ سے اس کا رابطہ صرف فون تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، مگر از لان اس پر بھی خوش تھا وہ معاذ کو سکول میں ہونے والی ہر بات بتاتا تھا۔

مگر اگلے سال صرف یہی کچھ نہ ہوا تھا بلکہ کچھ اور بھی ہوا تھا، اس وقت وہ سوئیٹھ اسٹینڈرڈ میں تھا، فٹ ٹرم اور مڈ ٹرم تو اس نے شاندار پرفورمنس کے ساتھ پاس کی تھی مگر فائنل میں وہ فیل ہو گیا اور یہ اس کے اساتذہ کے ساتھ ساتھ کلاس فیلوز کے لیے بھی حیرت انگیز بات تھی اور بہت دنوں تک یہ خبر سکندر حیات سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔

انہیں سکول انتظامیہ کی طرف سے فون کیا گیا اور جب وہ اس کا رپورٹ کارڈ

لے کر گھر آئے تو شدید غصے اور اشتعال میں تھے وہ سیدھے اس کے کمرے میں گئے اور شامت اعمال وہ اس وقت کسی تصویر میں بری طرح مصروف تھا جب زوردار آواز سے دروازہ کھلا اور سکندر حیات کی صورت نظر آئی ان کا سفید رنگ غصے سے سرخ ہو رہا تھا، از لان کے ہاتھ سے اسٹروک برش گر پڑا۔

انہوں نے ایک نظر اس کے کمرے میں دوڑائی، خوبصورتی سے سجا کمرہ جس کے سامنے والی دیوار کے ساتھ بیڈ تھا، بیڈ کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل اور دوسرے کونے میں ڈارڈ روب جبکہ تیسرے کونے میں کمپیوٹر رکھا ہوا تھا، دیواروں پر مشہور ہاکی پلیئرز کی تصاویر، ہاکیاں اور خود از لان کی بنائی ہوئی پورٹریٹس تھیں انہوں نے دوسری نظر اس پر ڈالی۔

سفید شرٹ اور بلو جینز مین اس کے سیاہ بال اس کے ماتھے پر گرے ہوئے تھے گندمی رنگت پر سایہ چاند بے حد نمایاں تھا اور اس کا تیکھا ناک اور شازمہ جیسی سیاہ آنکھیں کتنی گہرائی لیے ہوئے تھیں انہوں نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔

”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے رپورٹ کارڈ اس کے منہ پر دے مارا، از لان کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”کیا پوچھا ہے میں نے؟“ وہ دھاڑے۔

”پپ..... پاپا..... وہ“ وہ ہکا گیا انہوں نے بے اختیار ہوتے ہوئے ایک تھپڑ اسے مارا پھر دوسرا اور پھر اسے لاتوں اور ٹھنڈوں پر رکھ لیا، مغلظات جکتے وہ اسے جانوروں کی طرح پیٹ رہے تھے از لان کی دلخراش چیخوں سے سارے ملازم اکٹھے ہو گئے مگر اندر آنے کی کسی میں ہمت نہ تھی اور نور بی بی کا ناتواں وجود اسے بچانے میں ناکام تھا، ہر ضرب پر وہ تھوڑا ترپتا اور روتے ہوئے معافیاں مانگنے لگتا، انہوں نے اس کی ساری ہاکیاں توڑ دیں اور اس کی پینٹنگز پھاڑ دیں، نور بی بی نے اسے بچانے کی خاطر کمرے سے باہر دھکیل دیا، سکندر نے اسے دھکا دیا۔

”نفرت کرتا ہوں میں تم سے، باعث شرمندگی ہو میرے لیے دور ہو جاؤ میری نظروں سے ورنہ میں اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا گھونٹ دوں گا“

انہوں نے اسے دور جھٹکا وہ توازن برقرار نہ رکھا سکا اور لڑکھڑاتا ہوا نیچے گرا اور نور بی بی کی چیخیں نکل گئیں، نیچے اکیس سیڑھیاں تھیں وہ سیڑھیوں سے رول ہوتے ہوئے نیچے گرا اور گر کر سکت ہو گیا سارے ملازم یک بہ یک اس کی طرف بڑھے جبکہ سکندر اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئے، یہ دیکھے بغیر کہ اس کا کیا حشر ہوا؟ چھ دن وہ ہسپتالز رہا، اس کے ساتھ داہنی کلائی بھی فریکچر ہو گئی تھی، جب وہ گھر لوٹا تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ ازلان وہ نہیں رہا وہ بدل گیا تھا سرتاپہ یا شاید اس نے نیا جنم لیا تھا۔

اس نے اپنی ساری ایکٹیویٹیز ختم کر دیں، ہر وقت اسٹیڈیز اور بس یا پھر کمپیوٹر، اس کی زندگی اب ان دو چیزوں کے گرد گھومنے لگی۔

دو سال بعد مڈل کے زلزلے میں اس نے پورے ملک میں ٹاپ کیا تھا، اصولی طور پر سکندر کو اس پر فخر ہونا چاہیے تھا مگر وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کہ میں نہ کہیں کی تلاش کر لیتے ہیں۔

”تقسیم انعامات“ کی تقریب میں ہر شخص نے ایک ہی سوال پوچھا تھا۔

”کیا یہ آپ کا بیٹا ہے سکندر، لگتا تو نہیں“

”یہ تو بالکل بھی آپ سے مشابہت نہیں رکھتا“

”یہ آپ کا بیٹا ہے؟ حیرت ہے“

وہ اس کا پس منظر جانتے تھے، کہاں وہ خود وجہہ تشکیل اور کہاں ازلان عام صورت بلکہ بقول ان کے بد صورت انہیں شدید قلق تھا، کیا ہوتا اگر ان کا بیٹا بھی ان جیسا خوب صورت ہوتا وہ فخر سے اسے متعارف تو کرواتے، ایسی ہی ان کی سوچ تھی اور یہ شاید ان کی سطحی پن کی انتہا تھی۔

وہ چاہتے تھے کہ وہ ہارٹ سرجن بنے اس لیے انہوں نے اسے لندن بھجوا دیا، وہ چاہتے تھے کہ وہ اپنی ساری اسٹیڈیز لندن ہی میں مکمل کرے۔

کتنا رویا تھا وہ ان کے پاس بیٹھ کر، بہت منتیں کی تھیں اس نے۔

”پاپا مجھے نہیں جانا لندن، کیسے رہوں گا وہاں اکیلا“

”جیسے باقی لوگ رہتے ہیں“ ان کا لہجہ ویسا ہی سرد اور سپاٹ تھا وہ مایوس ہو کر اٹھ آیا، نور بی بی کے سینے سے لگا کتنی دیر روتا رہا، اب وہ ان سے سوالات نہیں کرتا تھا، شاید سارے سوالوں کے جواب پا چکا تھا اور پھر وہ لندن آ گیا، یہاں اس کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوئی اور اسے احساس ہوا زندگی کا کیوں کتنا وسیع ہے، اس کے ساتھ پڑھنے والے لڑکے کام بھی کرتے تھے، کوئی نہ کوئی پارٹ ٹائم جاب ڈس واشنگ، سیلز مین، بیرا، ویٹریس، غرض کوئی بھی جاب ہو وہ کرنے کے لیے تیار تھے، اسے حیرت ہوتی ہر ماہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم ڈیور ہو جاتی، وہ رقم کو بالکل ضائع نہ کرتا، صرف ضرورت کی اشیاء اور بس۔

وقت رفتہ رفتہ گزرنے لگا سکندر نے کبھی اسے فون نہیں کیا وہ خود پاکستان فون کرتا، نور بی بی سے بات ہو جاتی اور کبھی معاذ کو بھی فون کر لیتا اس کی تنہائی انہوں سے دوری، دیار غیر میں قیام اور بچپن کی محرومیوں نے مل کر اسے خدا سے نزدیک کر دیا یہ بے باک معاشرہ کبھی اس پر اثر انداز نہ ہوسکا، کتنے بڑھے ہاتھ جھٹکے تھے اسے تو اب کتنی بھی یاد نہ تھی۔

اس نے اپنی ساری توجہ کیریئر بنانے پر مرکوز کر دی وہ اس کی زندگی کا سب سے کامیاب خوبصورت اور مبارک دن تھا جب اسے ڈگری ملی اس نے ایک مقامی ہسپتال میں جاب کر لی اپنی زندگی ایک معمول پر سیٹ کر لی صبح فجر کی نماز ادا کر کے جاگنگ پر جانا پھر ناشتہ تیار کرنا کپڑے پہن کر ناشتہ کرنے کے بعد ہسپتال اور ہسپتال سے واپسی پر دو گھنٹے جم پھر گھر عشاء کی نماز، رات کا کھانا اگلے دن کی تیاری اور بس اس کی اس روٹین میں کسی دوسرے تیسرے کی جگہ ہی نہ تھی مگر سکندر حیات نے ایک بار پھر اس کو جھکانے کی کوشش کی مگر اب وہ سترہ سولہ سال کا بچہ تھا نہیں جوان کا دست نگر ہوتا وہ اسے واپس بلانا چاہتے تھے مگر اس نے صاف انکار کر دیا، نور بی بی کئی بار اسے واپس آنے کو کہہ چکی تھی تنگ آ کر اس نے پاکستان فون کرنا چھوڑ دیا، وہ بہت کم سکندر کا فون اٹینڈ کرتا، عام طور پر لینڈ لائن کا نمبر آنسرنگ پر لگا ہوتا اور اس کے پرسنل سیل کا پاکستان میں نمبر کسی کے پاس نہیں تھا، مگر ایک دن اس نے سکندر کی کال پک کی تھی اور اپنے جلتے

ساکت رہ گیا سامنے سے وہ چلی آرہی تھی اس کے پاس آکر وہ گھٹنوں کے بل گر پڑی۔
 ”کیوں کر رہے ہو تم میرے ساتھ ایسا؟..... کیوں؟ اگر تم غلط انتخاب تھے تو
 کیوں جن لیا میں نے تمہیں، کیوں سر پھوڑ رہی ہوں تم سے..... تم تو پتھر ہو..... تمہیں
 میری بات سمجھنا ہی نہیں تو پھر کس لیے..... یہ شب و روز کا رائیگاں سفر کس لیے کیوں
 ہوں تمہارے ساتھ اگر تم میرے ہو ہی نہیں..... اور کبھی ہو بھی نہیں سکتے..... کس لیے
 ہے یہ رشتہ..... اگر ہمیں ایک ساتھ رہنا ہی نہیں..... سب کچھ گنوا دیا میں نے اپنا آپ
 مٹا دیا تمہاری خاطر..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ رشتہ تمہارے لیے صرف سمجھوتہ تھا، فنا
 کر دیا خود کو اور تم نے کیا کیا میرے ساتھ؟“ اس کی شرٹ کے کالر کو مٹھیوں میں بھینچتے وہ
 سسک رہے تھے مسلسل ٹینشن، مسلسل جاگنا، رونا دھونا سوچنا اور کوئی حل نہ پانا یہ ٹینشن یہ
 ذہنی انتشار اسے پاگل پن کی حد پر لے جا رہا تھا۔

”کیوں ہوا اتنے ظالم تم اتنے ظالم، ترس نہیں آیا تم کو مجھ پر، ذرا بھی رحم نہیں
 آیا تمہیں مجھ پر کیوں ہوا اتنے بے حس تم اور اس سے زیادہ بے حس میں ہوں جو تمہارے
 ساتھ ہوں، میرے نام وہ سزائیں کیوں لکھ رہے ہو جن کے گناہ مجھ سے سرزد ہی نہیں
 ہوئے مجھے لگا تھا میں تمہیں بدل دوں گی، مجھے لگا تھا ایسا بہت پر امید تھی میں مگر تم نے
 مجھے غلط کر دیا میں غلط تھی میں مانتی ہوں مگر تم نے مجھے اپنی زندگی میں کیوں شامل کیا
 ازلان سکندر؟ کس لیے بولا؟“ وہ سسک رہی تھی۔

”آسیہ“ اس نے دھیمے سے اسے پکارا۔ مگر وہ اسے وہیں چھوڑ کر پلٹ کر بھاگتی
 ہوئی پارک سے باہر نکل گئی وہ بھی اس کے پیچھے بھاگا بھاگتے ہوئے آسیہ کو احساس نہیں ہوا
 تھا وہ غلط لین کر اس کر گئی، یلکھت وہ گاڑی سے نکلائی اور ازلان نے اسے کئی فٹ اوپر
 اچھل کر کنکریٹ کی سڑک پر گرتے دیکھا اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، آگے
 پیچھے کئی گاڑیوں کی بریک چرچرائے اور بے حد مصروف شاہراہ پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

☆☆☆

وہ ساکت سی بیٹھی تھی، آنسو قطار در قطار آنکھوں سے بہہ رہے تھے اتنا درد تو

بلتے دل کی ساری آگ، اپنے اندر البتہ آتش فشاں پرالٹ دیا۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے ہائیڈ پارک میں بیٹھا ہوا تھا ہائیڈ پارک برطانوی جمہوریت کی
 سب سے بڑی نشانی ہے۔

یہاں کسی بھی موضوع پر جب دل چاہے تقریر کی جاسکتی ہے اگر ہنگامہ آئی
 کے مرتکب نہیں ہوئے تو پولیس آپ کو کچھ نہیں کہہ سکتی، خواہ آپ امریکی صدر کو گالیاں
 دیں یا بھارتی وزیر اعظم کو، لوگ مزے لے لے کر سنتے ہیں جبکہ پولیس خاموش تماشا بنی
 بنی کھڑی رہتی ہے وہ بھی اس وقت مشہور زمانہ ہائیڈ پارک میں موجود تھا۔

”کیسے ایک بچے کی طرح استعمال ہوا میں آسیہ کے ہاتھوں اس نے کہا مجھ
 سے شادی کر لو میں نے کر لی میں نے اسے توجہ دی خود پر جبر کر کے ہی سہی، میں نے
 اسے کیر دی، میں نے اس کے لیے شاپنگ کی، کیسے؟ کیسے؟ کیوں کرتا رہا میں یہ سب؟
 اور پھر ڈیڑھ ماہ بعد سب ختم ہو گیا“ اسے وہ رات یاد آئی جب معاذ سے رابطہ نہ ہونے کی
 بنا پر اس نے احتشام صاحب کے آفس فون کیا اور اسے بتایا گیا کہ احتشام، معاذ احتشام
 اور صوفیہ احتشام کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈبچہ ہو چکی ہے اور صحیح معنوں میں اسے لگا کہ دنیا
 اندھیر کیسے ہوتی ہے دو دن اس نے کچھ کھایا نہیں، ایک پل کی نیند نہ لی، گھر جا کر وہ خود کو
 اسٹڈی میں بند کر لیتا اور وہ جھنجھلا جاتی، زبردستی پوچھنے کی کوشش کرتی پھر تھک ہار کر رونے
 بیٹھے جاتی، وہ سب دیکھتے ہوئے بھی اندھا بن گیا سب سنتے ہوئے بھی جیسے بہرہ بن گیا۔
 اس پر جیسے کسی چیز کا اثر ہی نہ ہوتا تھا، اندر باہر ایک جمود کی کیفیت طاری تھی
 یوں لگتا یہ جمود زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔

یکدم اس کا سیل فون بجنے لگا، اس نے بے دلی سے دیکھا گھر کے نمبرز بلنک
 کر رہے تھے اس نے سیل ایک طرف پھینک دیا اور سر اٹھا کر نیلے آسمان کو دیکھا، دونوں
 وقت مل رہے تھے ہر طرف ملگجاسا اندھیرا پھیل رہا تھا اور روشنیاں بتدریج روشن ہو رہی
 تھیں اسے بیٹھے ہوئے کچھ مزید وقت بیٹا جب اس نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا اور

جیسی زندگی بسر کی تھی، آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

☆☆☆

آسیہ کا سر چادر سے ڈھکا وجود بے حس و حرکت پڑا تھا اور از لان اس کے نزدیک بیٹھا تھا اس کے بال پیشانی پر بکھرے تھے اور سدا چمکتی رہنے والی آنکھیں نبھتی ہوئی تھیں ہونٹ ایک دوسرے میں یوں پیوست تھے گویا اب کبھی نہ کھلیں گے، پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کے دائیں طرف پڑی تھی۔

اپنے شانے پر کسی ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے اس نے مڑ کر دیکھا وہ جوزف تھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں غالباً وہ روتا رہا تھا جوزف کفن دفن کا انتظام کر کے آ رہا تھا، صرف آدھ گھنٹے میں وہ اپنے آخری سفر پر جانے کے لیے تیار تھی میت گاڑی لندن کی پرجھوم سڑکوں پر سفر کرتی ہوئی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد قبرستان پہنچی۔

مسجد سے آنے والے مولوی نے امامت کی اور دو منٹ میں نماز جنازہ ختم ہو گئی اس کے بعد تقریباً دس پندرہ منٹ مختلف فارمز مکمل کرنے میں لگے۔

”از لان آریو اوکے؟ میں تمہارے ساتھ گھر چلوں؟“ جوزف نے ازراہ

ہمدردی کہا۔

”آئی ایم فائن“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا اور مڑ کر چلنے لگا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ بہت نارمل انداز میں تیار ہوا تھا اور ہسپتال گیا تھا زیادہ تر لوگ اس کی وائف کی حادثاتی موت سے آگاہ تھے اس لیے جو جو ملتا گیا تعزیت کرتا گیا وہ بے تاثر انداز میں سر جھکاے سنتا رہا، ایک لفظ نہ بولا تھا آنسو نہ بہا نہ کی قسم کھائی تھی ورنہ دل تو سینے میں کلراتا رہا، آنسو پلکوں پر سر چٹختے رہ گئے سارا دن نارمل رہتے رہتے وہ گھر پہنچ کر نڈھال ہو گیا، دیر تک بیڈ پر ساکت پڑا رہا ذہن میں معاذ کی آواز سرسراتی رہی۔

”وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا از لان کسی کے جانے سے زندگی رکتی نہیں“

اور پھر یوں ہوا کہ زندگی گزرنے لگی، اب اس کے سیل فون پر گھر کے نمبرز

اسے تب بھی محسوس نہ ہوا تھا جب ماما پاپا اور معاذ بھائی اسے تنہا چھوڑ کر گئے تھے اس دنیا میں جہاں منافقت اور دکھ اور ریا کاری کے سوا کچھ تھا ہی نہ، اب بھی وہ اپنے لیے نہیں رو رہی تھی اس شخص کے لیے رو رہی تھی جو اس کا خون کا رشتہ نہیں رکھتا تھا، کوئی رشتہ نہ تھا درمیان میں کچھ بھی تو نہیں مگر پھر بھی اسے اس شخص کا دل رلا رہا تھا کیا اس شخص سے زیادہ کوئی دکھی ہو سکتا ہے جسے کبھی محبت نہ ملی ہو، اسے اپنا بچپن یاد آیا کتنا مکمل اور خوبصورت دور گزارا تھا اس نے اپنے ماما اور پاپا کے ساتھ محبتیں لٹانے والی ماں، شفقتیں لٹاتا باپا اور جان چھڑکتا بھائی، اتنی محبتیں ملیں تھیں گھر سے کہ باہر دوست بنانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی لیکن اس میں کچھ دخل اس کی ریز رو طبیعت کا بھی تھا، اس کا سب سے اچھا دوست تو معاذ تھا اتنا پیارا اور نرم دل کہ اسے خواہ مخواہ ہی بھائی پر پیار آتا اس کی شادی کے سلسلے میں وہ کتنی پر شوق تھی اتنی مشکلوں سے وہ شادی پر رضا مند ہوا تھا پھر اسے لڑکی پسند نہ آتی خدا خدا کر کے کوئل و قارن منتخب ہوئی تھی، جس دن انگیجمنٹ تھی اس دن سیاہ ڈنرسوٹ میں وہ بے پناہ پینڈسم اور خوش لگ رہا تھا فنکشن چونکہ کمبائن تھا اس لیے شام سے ہی تیاریاں دونوں طرف عروج پر تھیں وہ اسے بلانے آئی تو ایک لمحے کو ٹھٹھک سی گئی تھی اس کی وجاہت ہرگز آج نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی پھر اسے وہ منسوس سیاہ رات یاد آئی جو اس سے اس کا پیارا بھائی اور جان سے عزیز ماں باپ چھین کر لے گئی تھی اور معاذ بھائی نے آخری فون بھی از لان کو کیا تھا، وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ نمبر بیچ پر جا رہا ہے مگر فرشتہ اجل نے موقع ہی نہ دیا تھا اور اسے اب سمجھ آئی کہ اس کا اچھا دوست معاذ تھا اور معاذ کا از لان، اور یقیناً معاذ از لان کے متعلق سب کچھ جانتا تھا مگر اس نے حرا سے کبھی کچھ نہ شیر کیا تھا، بلکہ کچھ بتانے کو تھا ہی کہاں پچھلے کچھ عرصے سے حرا کو لگنے لگا تھا کہ شاید اس سے زیادہ دکھی اور مظلوم اور کوئی نہیں، پہلے ماما پاپا بھائی کی حادثاتی جدائی رشتہ داروں کی بے اعتنائی، سکندر کی اچانک موت، تنہا رہنا آسان کہاں تھا ایک مسلسل پڑمردگی اور اضمحلال کی کیفیت طاری رہتی اور اب..... (آہ)..... کیا اس شخص سے بھی زیادہ کوئی مظلوم تھا جس نے باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں

”میں حرا احتشام ہوں، معاذ احتشام کی چھوٹی بہن“ حرا نے دھیمے سے تعارف کروایا۔

ازلان کے سر پہ جیسے کسی نے بم پھوڑا۔

”کیا؟ معاذ کی بہن..... حرا.....؟“

”جی..... میں حرا ہوں“

”لیکن مجھے پتا چلا تھا کہ.....؟“ اس نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”آپ کو ٹھیک پتا چلا تھا، ماما، پاپا اور بھیا اب اس دنیا میں نہیں ہیں“ ناچاہتے ہوئے بھی آنکھیں بھر آئیں وہ خاموش کھڑا رہا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ کچھ لمحوں بعد وہ خود پر قابو پا کر بولی۔

”فائن، آپ سنائیں“ وہ سنہل کر بولا۔

”بس ٹھیک ٹھاک آپ بتائیں کیا مصروفیات ہیں؟“

”کچھ خاص نہیں ہاسپٹل اور بس“ اخلافا اسے حرا سے بھی یہ سوال پوچھنا چاہئے تھا مگر اس نے نہیں پوچھا۔

”ازلان آپ مجھے اپنا پرسنل نمبر دے سکتے ہیں، تفصیل سے باتیں ہوں گی، اس وقت تو آپ بھی بڑی ہوں گے“ اس نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔

وہ کچھ حیران تو ہوا لیکن بہر حال اس نے اپنا نمبر دیا اور الوداعی کلمات کے بعد فون بند کر دیا۔

بند مٹھی ٹھوڑی کے نیچے نکائے وہ ایزی چیئر سے سر نکائے مسکرا رہی تھی، آنکھوں میں ستاروں سی چمک تھی۔

”میں تمہارے دل کی سنگاخ دیواروں میں سیندھ لگانے والی ہوں ازلان احمد خواہ مجھے پاش پاش ہونا پڑے۔“

☆☆☆

آمنہ آئی ہوئی تھی ساتھ ایاز بھی تھے اس وقت وہ تینوں لان میں موجود تھے نیبل

بلنک نہیں کرتے تھے، نہ اسے یہ جلدی تھی کہ گھر کوئی اس کے انتظار میں جاگتا ہوگا۔

میرے چارہ گر

میرے چارہ گر

میرے ہاتھ سے تیرے ہاتھ تک

وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ

اسے ناپتے اسے کاٹتے

میرا سارا وقت نکل گیا

نہیں جس پہ کوئی نشان پا

میرے سامنے ہے وہ راہ گزر

میرے چارہ گر، میرے چارہ گر

تو میرے سفر کا شریک تھا مگر ہمسفر نہیں ہمسفر

☆☆☆

ڈاکٹر ایاز سے اسے ازلان احمد کے ہاسپٹل کا نمبر اور نیٹ آئی ڈی مل چکی تھی، اس کے علاوہ وہ کچھ معلوم نہ کر سکے تھے حرا کے ذہن میں ہر بات اب نہایت واضح تھی، ایک بہت کلیئر پلان تھا بہت دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی وہ گہری سوچ میں تھی پھر اس نے فون اپنی طرف کھینچا اور ازلان کے ہاسپٹل کا نمبر ملانے لگی، آپریٹر نے اسے ہولڈ کر دیا اور تین منٹ بعد وہ لائن پر تھا۔

”ایس ازلان سپیکنگ“ مدھم اور گمبیر لہجہ، حرا کے ہاتھ پیر سنسنا اٹھے۔

”السلام وعلیک“ دھیمے سے سلام کیا۔

”وعلیک السلام“ وہ چونک گیا، لانگ ڈسٹنس کال اور وہ بھی لڑکی کی، وہ

حیران سا تھا۔

”ازلان احمد“ حرا نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا۔

”آف کورس“ وہ الجھ کر بولا۔

”گھر چل کر بتاؤں گا“ انہوں نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے الوداعی کلمات کی ادائیگی کے بعد آمنہ نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور وہ واپسی کے لیے چل پڑے، حرا بھی اٹھ کر اندر چلی آئی۔

”بی بی جان“ اس نے لاؤنج میں کھڑے ہو کر آواز دی۔
 ”کچن میں آ جاؤ بیٹے، انہوں نے جوابی آواز لگائی تو وہ کچن کی طرف مڑ گئی۔
 ”زگسی کوفتے کی خوشبو سے کچن مہک اٹھا تھا، وہ سلیب پر چڑھ کر بیٹھ گئی، وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے کیمین کھولا اور پلیٹ اور چمچ نکالا اور کوفتہ ڈال کر ٹیسٹ کرنے لگی۔

”آہ..... مزہ آ گیا..... سچ بی بی جان یو آر گریت، کتنا ذائقہ ہے آپ کے ہاتھ میں“ وہ مزے لے لے کر کھا رہی تھی اور نور بی بی جیسے کئی سال پیچھے ماضی میں چلی گئیں۔
 ”ازلان کو بھی بہت پسند تھے“ وہ جیسے خواب میں بولیں تھیں۔

”جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ وہ دانستہ انجان بن گئی تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگیں۔

”ارے..... تمہیں..... تم اٹھو..... جاؤ منہ دھو لو میں ٹیبل لگواتی ہوں“ انہوں نے سنبھل کر کہا تو وہ سر ہلاتی اٹھ گئی۔

”کچھ سیاہ باب بند ہی رہنے چاہئیں کیونکہ اگر وہ کھل گئے تو کئی زندگیاں تاریک ہو جائیں گی“ انہوں نے خود کلامی کی۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ایک دم سر میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں، کچھ دیر وہ نظر انداز کرتا رہا مگر جب آواز زیادہ ہی دماغ میں گھسنے لگی تو اس نے مجبوراً آنکھیں کھول کر دائیں طرف پڑے سیل فون کو اٹھایا، مندی آنکھوں سے اسکرین کو دیکھا اور یکا یک ساری نیند کا فور ہو گئی، فوراً اس نے نمبر پیش کیا اور کان سے لگاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا جلد ہی اسے مطلوبہ چیز سائیڈ ٹیبل پر نظر آ گئی، پینڈ فری لگا کر اس نے فون جیب میں گھسایا اور ہاتھ روم کی طرف دوڑ لگا دی، مہر تیاں قابل دید

پر شام کی چائے کے لوازمات رکھے تھے اور وہ بھی چائے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے، ماحول میں ہلکی خنکی ایک خوشگوار احساس دلا رہی تھی۔

”کیا امپرومنٹ ہے حرا؟“ آمنہ نے بے ساختہ پوچھا۔

”ابھی پتا چل جاتا ہے“ وہ دھیمے سے مسکرا کر حرا کی طرف متوجہ ہوئے۔

”ویری پازیو“ وہ کامیابی کے احساس سے سرشار سی بولی۔

”کس حد تک؟“

”ازلان کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ میں معاذ کی بہن ہوں اور لاشعوری طور پر ہی وہ مجھے معاذ کی جگہ دے چکا ہے، اس لیے مجھے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی“ حرا نے تفصیل سے بتایا۔

”تمہیں لگتا ہے وہ تمہاری بات مانے گا“ ایاز کی آنکھوں میں چمک سی بھر گئی

تھی انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

”بالکل انکل، ہمارے درمیان اب کافی دوستی ہے“

”تو پھر اسے پاکستان آنے پر آمادہ حرا“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

”مجھ سے اب سکندر کی امانت کی حفاظت دشوار ہوتی جا رہی ہے میں چاہتا ہوں جلد از جلد یہ سب کچھ اپنے اصل مالک کے ہاتھ میں چلا جائے“ وہ کچھ تھکے ہوئے سے لگے، سکندر حیات گردیزی کی جائیداد اور اثاثوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ وہ ہسپتال بھی دیکھ رہے تھے، تھکن لازمی تھی۔

”جی انکل میں کچھ کرتی ہوں، وہ جو پراجیکٹ میں نے آپ سے کہا وہ کہاں

تک پہنچا؟“

”کام جاری ہے، تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہونے تک انشاء اللہ تمہیں خوشخبری

ملے گی“ انہوں نے یقین سے کہا۔

”یہ کیا کورڈ ورڈز میں باتیں کر رہے ہیں آپ، کچھ مجھے بھی بتائیں“ آمنہ

جھنجھلا کر بولیں۔

نہ جانے کون سی بات آخری ہو جائے
نہ جانے کون سی رات آخری ہو جائے
حال چال پوچھتے رہا کرو ہم سے
نہ جانے کون سی سانس آخری ہو جائے

ازلان کا دھیمہ اور پرسوز لہجہ اسے اندر تک گھائل کر گیا وہ جیسے تڑپ اٹھی۔

”شٹ اپ ازلان، جسٹ شٹ اپ“ وہ چلا اٹھی۔

”لو تو اس میں چلانے کی کیا بات ہے اتنا اچھا شعر سنایا ہے میں نے کل ہی ایک اردو نیوز پیپر سے پڑھا تھا“ وہ مسکراتا ہوا بتا رہا تھا اور حرا نے ایک طویل اور آسودہ سانس خارج کی۔

”ڈرامیونگ کر رہے ہو؟“ وہ پوچھنے لگی

”ہاں اڑنے سے تو رہا“ وہ پھر ہنسا۔

”تو فون کیسے ریو کر رہے ہو“ وہ حیران ہوئی۔

”ہینڈ فری زندہ باد“ وہ پھر کھلکھلایا، تو وہ بھی ہنس دی۔

”سارجنٹ کو دھوکہ دے رہے ہو بدتمیز“ وہ اسے چڑانے لگی۔

”سب چلتا ہے یار“ وہ محظوظ ہوا۔

”اس سے پہلے کہ وہ تمہیں ٹکٹ دے میں فون رکھتی ہوں اللہ حافظ، اپنا خیال رکھنا“ اس نے فون بند کر دیا، ازلان نے مسکراتے ہوئے ہینڈ فری اتار دیئے اسے بہت اچھی طرح احساس تھا کہ جو کام آسیہ عبدالرحیم اس کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی نہ کر سکی وہ حرا احتشام نے اتنی دور ہزاروں میل دور بیٹھ کر کر لیا تھا، ہاں وہ بدل رہا تھا، وہ اسے بدل رہی تھی کیا تھا اس کی محبت میں یا شاید اس کی دوستی میں شاید سب کچھ، مان، خلوص، محبت اور سب سے بڑھ کر رعب، وہ اس پر بے تحاشہ رعب جماتی، اسے کبھی بھی معاذ کی کمی محسوس نہ ہوئی وہ بالکل معاذ جیسی ہی تو تھی پھر کمی کیسے محسوس ہوتی، ویسی ہی ہمدرد، مخلص، نرم مزاج اور سب سے بڑھ کر اچھی سامع کبھی کبھی ازلان کو لگتا اگر وہ اسے

اور قابل داد تھیں۔

”کیسی ہو حرا؟“ اس کے سلام کا جواب دے کر اب وہ فرصت سے منہ دھونے میں مصروف ہوا۔

”تم کیا کر رہے ہو ازلان؟ کہیں مصروف ہو کیا؟“ وہ کچھ جھنجھلا کر بولی۔

”صرف چند منٹ، برش کر لوں“ وہ اجازت مانگ کر پھر مصروف ہو گیا۔

”کیا رات دیر سے گھر آئے تھے اور کھانا یقیناً نہیں کھایا ہوگا اب اسی لیے دیر سے اٹھے ہوناں اور اب بغیر ناشتے کے ہاسپٹل بھاگنے کی پڑی ہے“ وہ سوال پر سوال کر رہی تھی اس نے کلیاں کیس اور لباس بدلنے میں مصروف ہو گیا۔

”رات ایمر جنسی کی وجہ سے لیٹ آیا تھا اور باقی بھی تمہارے سارے اندازے درست ہیں“ وہ کف لنکس بند کرتا عجلت میں بولا۔

”ازلان پلیز کچھ کھا کر جانا“ وہ تنبیہی لہجے میں بولی۔

”کم آن حرا، وقت نہیں ہے میرے پاس، پہلے ہی لیٹ ہوں“ وہ شوز

پہن رہا تھا۔

”ازلان پلیز“ وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

”ناشتہ بنانے کے لیے وقت نہیں ہے“ اب وہ بال بنا رہا تھا۔

”ازلان میں فون بند کر رہی ہوں“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

”حرا“ وہ جیسے ہار سا گیا۔

”اچھا دیکھتا ہوں کچن میں کچھ“

”تم دودھ پی لو، دودھ تو ہوگا نا فرج میں“ وہ مشورہ دینے لگی۔

”اوکے دیکھتا ہوں“ وہ کہتا ہوا کچن میں چلا گیا، پھر فرج سے دودھ کا پیک

نکالا، گلاس میں انڈیلا اور گھونٹ گھونٹ پینے کے بعد لائٹس آف کرتا وہ بیرونی بیرونی دروازہ لاک کرنے لگا۔

”اوکے ازلان پھر شام کو فون کرنا، میں فون رکھتی ہوں“ وہ ادلوداعی مانگنے لگی۔

ایک بار اس نے حرا سے اپنی تصویر میل کرنے کو کہا تو وہ کھلکھلا اٹھی۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے“ وہ برہم ہوا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”ازلان میں بہت بد صورت ہوں، کالی، بھدی، چنی منی آنکھیں، روکھے بھیکے بال، چھوٹا سادہ، کیا کرو گے مجھے دیکھ کر؟ پچھتاؤ گے کہ فرمائش کیوں کی؟ اسی لیے اب تک میری شادی نہیں ہوئی، وہ رنجیدگی اور افسردگی کے طے جلے تاثر سمیت کہہ رہی تھی وہ کچھ الجھا۔

”معاذ تو بہت ہینڈسم؟“

اس نے ازلان کی بات کاٹ دی۔

”یہ کوئی کرائے میریا تو نہیں کہ خوبصورت پیرنٹس کے بچے خوبصورت ہی ہوں“ اس نے سنجیدگی سے کہا، وہ تھم سا گیا، ذہن کے آئینے پر اپنی شبیہ لہرا گئی۔

”ہاں بالکل یہ کوئی کرائے میریا تو نہیں“ اس نے سنبھل کر کہا اور پھر اس کے بعد حرا سے اس موضوع پر کبھی بات نہ کی۔

☆☆☆

ایک بار پھر

دوبارہ ساجا تھا

قسمت بہت غرور سے مسکرا رہی تھی

تجھ سے کہا تھا نا، وہ میرا ہے

محبت سسکتی ہوئی بولی

تو نے اسے مجھ سے چھین لیا

قسمت نے قہقہہ لگایا

”وہ تو ہمیشہ سے میرا ہے دیکھنا میں کیسے اس کی زندگی بدلتی ہوں“ اور آسیہ کی

محبت نا کام لوٹ گئی۔

توڑ دی ہر آس کی ڈوری

ساری رات بھی اپنی داستانیں سناتا رہے تو وہ پلک تک نہ جھپکائے گی، ایسی ہی تھی وہ اور معاذ بھی تو ایسا ہی تھا جہاں جاتا چھا جاتا جسے ملتا اسیر کر لیتا اور وہ بھی معاذ جیسی تھی اسی لیے تو رسمی تعارف سے جان پہچان اور جان پہچان سے گہری دوستی تک کا مرحلہ اس نے اتنی تیزی سے صرف اس لیے طے کر لیا تھا کہ اس میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں اور جب اس نے ازلان کو بتایا کہ وہ اس کا پہلا دوست ہے تو وہ کتنی دیر ہنستا رہا۔

”ہاؤ کین آئی بیلو اٹ حرا“ وہ پھر ہنسنے لگا۔

”تم لڑکی ہو تنہا کسی لڑکی سے بھی دوستی نہیں آمیزنگ“ اور وہ کتنا ناراض

ہو گئی تھی۔

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو“ اس کے انداز میں اتنی دلی ربائی ہوتی باتوں میں اتنی بے ساختگی کہ مقابلہ تغیر ہوتا چلا جائے، ازلان احمد بھی کوئی عام انسان نہ تھا بقول آسیہ ”ہارڈ اسٹون“ تھا مگر وہ حرا احتشام اسے یوں اپنے سحر میں جکڑ گئی گویا وہ اس کا معمول ہو، وہ اس سے ایک دو دن میں بے تکلف نہیں ہو گیا تھا ایک عرصہ لگا تھا، آغاز میں ان کا موضوع صرف ”معاذ“ تھا پھر رفتہ رفتہ گفتگو کا دائرہ وسیع ہونے لگا، دلوں میں گنجائش بنتی گئی اور رابطے گہرے ہونے لگے اور ازلان کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ کب حرا احتشام پر اپنا آپ کھو بیٹھا، اس نے حرا سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی، بے شمار اذیت ناک راتوں کا تذکرہ چھڑا، بے شمار محرومیاں زیر بحث آئیں اور وہ اسے سب بتاتا چلا گیا سکندر حیات گردیزی کا جنون اور شاید نفسیاتی بیماری ان کی ازلان سے بے زاری، ماں سے محرومی، پھر بی بی جان سے دوری یہ سب وجوہات اتنی زیادہ تھیں اس کے واپس نہ آنے کے لیے حرا ایک لمحے کو چپ رہ جاتی پھر چاہتے ہوئے بھی بات نہ کر پاتی کہ وہ اس قدر دلبرداشتہ تھا کہ قطعاً اس موضوع پر گفتگو کرنے کو آمادہ نہ ہوتا، اگر ازلان نے اس سے کچھ چھپایا تھا تو آسیہ سے شادی کی بات تھی جو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چھپا گیا جانے کیوں بتانے کو دل نہ مانا۔

اسے حرا اچھی لگی تھی اس کی باتیں اچھی لگتی تھیں اس کا دھونس جمانا اچھا لگتا تھا

آسوں میں کیا رکھا ہے
عشق محبت ہیں سب باتیں
باتوں میں کیا رکھا ہے
قسمت میں جو لکھا ہے
اکثر ہو کر رہتا ہے
چند لکیریں الجھی سی
ورنہ ہاتھوں میں کیا رکھا ہے

☆☆☆

حرا احتشام اس وقت ڈاکٹر ایاز کے ہاسپٹل میں ان کے سامنے بیٹھی تھی اور نہایت سنجیدہ گفتگو جاری تھا، موضوع غالباً نہایت اہم تھا۔

”آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں انکل پلزز، جب یہ ہاسپٹل آپ نے اور سکندر انکل نے شروع کیا تھا تب ستر فیصد شیرز سکندر انکل کے اور صرف تیس فیصد شیرز آپ کے تھے لیکن اب آپ اس پوزیشن میں ہیں کہ اس ہاسپٹل کو خرید سکتے ہیں میں یہ سارا پیسے اپنے پراجیکٹ پر انویسٹ کرنا چاہتی ہوں ایسا نہیں ہے کہ بینک اکاؤنٹس میں میرے پاس پیسے نہیں ہیں لیکن میں اس ہاسپٹل کی بجائے ایک فلاجی ہاسپٹل بنانا چاہتی ہوں یہ ہاسپٹل شہر کے مہنگے ترین پرائیویٹ ہاسپٹلز میں سے ایک ہے جہاں صرف اپر کلاس کی اپروچ ہے میں غریبوں کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں آپ ہمارے ملک میں موجود ہاسپٹلز اور ان کی حالت سے بخوبی واقف ہیں“ وہ بولتی گئی۔

”تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں حرا، لیکن تمہارے حسب منشا میں کام کروا چکا ہوں، تمہارے ”میڈیکل کمپلیکس“ کی عمارت تیار ہے، فرنیچر کا لہڈہ دیا جا چکا ہے پھر ان پیسوں کا کیا کرنا چاہتی ہو“ وہ کچھ الجھ کر کہہ رہے تھے، وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

”آپ سب سے اہم بات بھول رہے ہیں الٹرا ساؤنڈ، سی ٹی اسکین، ایم آئی آر بلڈ بینک، ہتھیا لوجیکل لیبارٹری، یہ سب ایکوپمنٹ کہاں سے آئے گا“ وہ چونک کر

سیدھے ہو گئے۔

”ہوں یہ واقعی میرے ذہن سے نکل گیا تھا، خیر سوچتے ہی کچھ، اگر صحیح چیز لی جائے جس کی گارنٹی بھی ہو اور آفٹر سیل سروس بھی تب یہ سب ایکویمنٹ دو سے تین کروڑ تک کا آسانی سے ہو جاتا ہے، میں کچھ بین الاقوامی فرمز سے بات کرتا ہوں اور پھر تمہیں تفصیل بتاتا ہوں“ انہوں نے اسے تسلی دی۔

”اور ہاسپٹل کا معاملہ؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
”اوکے، اوکے اس پر بھی بات کریں گے لیکن فی الحال نہیں“ وہ بات ختم کر کے اٹھ گئے۔

”مجھے راولڈ لینا ہے ہاسپٹل کا تم چلو گی“ انہوں نے پوچھا تو گہری سوچ میں ڈوبی حرا چونک کر سیدھی ہوئی اور پھر سر ہلا کر ان کے ساتھ چل پڑی۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا اسی لیے وہ بہت سکون سے سو کر اٹھا، پون گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ایک پاکستانی ریستورنٹ سے حلوہ پوڑی کا ناشتہ کرنے کے بعد واپس آ کر وہ اپارٹمنٹ کی تفصیلی صفائی میں مصروف ہو گیا ایسا نہیں تھا کہ ڈھیروں کے حساب سے گندگی پھیلی ہو بلکہ وہ ہر چھٹی پر گھر صاف کرنے کا عادی تھا اس کے گھر میں کہیں بھی بد نظمی یا بے ترتیبی نہیں تھی، وہ بہت تنظیم و ترتیب سے رہنے کا عادی تھا، نیکی سیٹ کر کے رکھتے ہوئے اس کی نظر بیڈ کے سامنے دیوار پر لگی تصویر پر پڑی اور ایک لمحے کو وہ تھم گیا، ذہن پر کسی یاد نے ہولے سے دستک دی، اسے یاد تھا جب وہ آسیہ کی ضد پر وہ ”رابرٹ وکٹر ہال“ جہاں وہ سمغنی آرکسٹرا کی پرفارمنس دیکھنے گئے تھے اور واپسی پر ایک پروفیشنل فوٹو گرافر سے آسیہ نے ضد کر کے اپنی اور ازلان کی تصویر بنوائی تھی، پولورائیڈ کیمرہ ہونے کی بنا پر تصویر وہیں وصول کر لی اور بعد میں آسیہ نے خود فوٹو فریم میں سجا کر اس دیوار پر لگا دی تھی، پتا نہیں کیوں اسے آسیہ کی ڈیٹھ کے بعد کبھی اس تصویر کا خیال نہیں آیا بلکہ خیال آتا بھی کیسے آسیہ کی وفات کے اکیس دن بعد حرا کا پہلا فون آیا تھا اور پھر

گویا یہ حال ہو گیا بقول شاعر۔

نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا

جو رہی سو بے خبری رہی

”اور اب؟“ اس نے آہستگی سے تصویر اتار کر پکڑ لی اور اسے لگا جیسے آسیہ

زندہ ہو کر اس کے سامنے آگئی۔

چلو چھوڑو!

محبت جھوٹ ہے

عہد وفا اک شغل ہے بے کار لوگوں کا

طلب سوکھے ہوئے پتوں کا بے رونق جزیرہ ہے

خلش و میک زدہ اوراق پر بوسیدہ سطروں کا ذخیرہ ہے

چلو چھوڑو

کہ اب تک میں اندھیروں کی دھمک میں سانس کی ضربوں پہ

چاہت کی بنا رکھ کر سفر کرتی رہی ہوں

مجھے احساس ہی کب تھا

کہ تم بھی موسموں کے ساتھ اپنے پیراہن کے رنگ بدلو گے

چلو چھوڑو

میرا ہونا نہ ہونا اک برابر ہے

تم اپنے خال و خد کو آئینے میں پھر کھرنے دو

تم اپنی آنکھ کی بستی میں پھر سے ایک بنا موسم اترنے دو

میرے خوابوں کو مرنے دو

چلو چھوڑو

محبت جھوٹ ہے

”بولو نا ازلان احمد میری محبت جھوٹ تھی نا“ وہ طنزیہ کہہ رہی تھی وہ ساکت

بیٹھا رہا۔

”دیکھو تمہیں پانے کی خواہش، تمہیں سمجھنے کی چاہ کتنی مہنگی پڑی ہے، دیکھو نا،

کیا رشتہ تھا میرا تمہارا، چلو میں تمہیں بتاتی ہوں“

تیرا میرا رشتہ کیسا

اس کو سلجھاتے سلجھاتے

اپنے دل کی دیواریں زخمی کر بیٹھا ہوں

رشتہ شاید سلجھ نہ پائے

لیکن اس کو سلجھانے کی دھن میں

جانناں.....؟

سارے خواب بھلا بیٹھا ہوں

اپنا آپ گنوا بیٹھا ہوں

”ہاں اپنا آپ فنا کر دیا میں نے، مار دیا خود کو، لیکن مجھے خوشی ہے ازلان،

میں نے تمہیں محبت کرنا سکھادی“ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ازلان بیڈ پر گر پڑا، اس کے وجود کو جھٹکے سے لگ رہے تھے پینچی مٹھیوں کے

ساتھ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”ہاں تم میری چاہت نہیں تھیں، نہیں کرتا تھا میں تم سے محبت، تم خود میری

زندگی میں شامل ہوئیں تھیں، میں قصور وار نہیں ہوں، میں نے تمہیں نہیں مارا، وہ تمہاری

بد احتیاطی تھی، لیکن آس تم سچ کہتی ہو، میں تم سے تو محبت نہ کر سکا لیکن تم نے مجھے محبت

کرنا سکھادی“ جو آنسو آسیہ کے دنیا سے جانے کے بعد نہ بہے تھے وہ آج بہہ نکلے تھے

ساری حدیں سارے بند توڑ کر۔

”تم بہت اچھی تھی آس، لیکن میں اچھا نہیں تھا، اگر میں تمہیں تمہارا حق نہ

دے سکا تو اس میں تمہارا بھی قصور تھا تم میں بھی وصول کرنے کی اہلیٹی ہی نہ تھی، جیسے۔

جیسے حرا میں ہے، توجہ، وصول کرنے کی صلاحیت وہ بھی حق سمجھ کر، اگر تم ایسی ہوتیں تو

ان کے ایجنٹ؟“ حرا نے کہا۔

”ہم خود کریں گے ڈائریکٹ ڈیل اس طرح ڈیل مین کا منافع بچے گا“ انہوں

نے بتایا۔

”اس کے لیے کسی کو جانا پڑے گا؟“

”یس، اس میں وقت کی بچت ہوگی“

”کس کو سلیکٹ کیا ہے آپ نے؟“ حرا نے پوچھا۔

”یہ کام ابھی رہتا ہے تم بھی سوچنا لندن کس کو جانا چاہیے؟“ انہوں نے معنی

خیز انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی، وہ چونک کر سیدھی ہوئی پھر جیسے ان کی بات کی تہہ تک پہنچ گئی، اگلے لمحے اس کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔

”یقیناً اس کے لیے مجھ سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے؟“ وہ بھی ذہانت سے

بات پک کر بچی تھی اس لیے مسکرا کر بولی۔

”آف کورس مائی جینس ڈائر، یو آر دا بیسٹ چوائس“ وہ داد دیے بنا رہ نہ سکے۔

”اور یہ ایک نہیں دو مشن ہوں گے، مجھے صرف ایکو پمنٹ ہی نہیں پاکستان

ڈلیور کرنا بلکہ کسی اور کو بھی ڈلیور کرنا ہے“ وہ کہہ رہی تھی وہ ہنس دیئے پھر اسے مزید تفصیلات بتانے لگ گئے۔

☆☆☆

اس نے جھنجھلاہٹ اور غصے سے نمبر ری ڈائل کیا اور تیل جاتی سننے لگا تیل

جارہی تھی پھر ریکارڈ شدہ آواز سنائی دینے لگی۔

“Your dialed number is not answering”

اس نے ایک طویل سانس لینے ہوئے مستقل مزاجی سے پھر نمبر ڈائل کیا اور

خوش قسمتی سے فون اٹھالیا گیا۔

”ہیلو“ آواز یقیناً کسی دیہاتی عورت کی تھی، وہ چونک گیا۔

”حرا سے بات کروادیں“

آج میں یہاں اس اسٹیج پر نہ ہوتا۔“ وہ گھٹی گھٹی سکیوں میں رو رہا تھا۔

☆☆☆

”یہ کچھ فرموں کی تفصیلات ہے حرا جو کنٹینر میں نے مانگی تھی اس میں کچھ بین الاقوامی فرموں نے دلچسپی ظاہر کی ہے ایک جرمنی سے ہے دوسری لندن اور تیسری ناروے سے متعلق ہے مجھے سب سے معقول لندن کی فرمز کی ٹرمز اور ڈیمانڈز لگی ہیں“ ڈاکٹر ایاز، حرا کو تفصیل سے بتا رہے تھے۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ بہتر سمجھیں لیکن میں نے آپ سے ہاسپٹل میٹر بھی ڈسکس کیا تھا کیا سوچا ہے آپ نے؟“ وہ دونوں انداز میں بولی۔

”کچھ نہیں سوچا میں نے تمہارے ہسپتال کے لیے Equipment اور لیبارٹری میں دے رہا ہوں“ وہ بھی دونوں لہجے میں بولے۔

”یو مین ڈومیشن؟“ وہ دم بخود رہ گئی۔

”آف کورس“

”اس کی Limit کیا ہے؟“ وہ خوشی سے پوچھنے لگی، تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

”یہ سب Equipment میری طرف سے ہے“ وہ ایزی چیئر پر بیک ٹکا کر کہہ رہے تھے۔

حرا کا منہ حیرت سے کھل گیا، پھر اس نے خود پورا قابو پالیا۔

”ٹھینکس آلات..... ٹھینکس..... اگین ٹھینکس“

”ویکم“..... وہ فراغ دلی سے بولے..... پھر اسے بتانے لگے۔

”فائل میں کرچکا ہوں اب ہمیں آرڈر (Place) کرنا ہے ڈیل فائل

ہونے کے بعد ہی آفیشل کلیرنس میں اور ایکو پمنٹ کی ڈلیوری میں چھ مہینے لگ جائیں گے تب تک ہم ہسپتال کی عمارت میں توسیع کے ساتھ ساتھ باقی ضروری انتظامات بھی کر لیں گے“

”جو ایکو پمنٹ اور مشینری آئے گی اس کی ڈیل کون فائل کرے گا؟ یہاں

شدید افسوس ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا اس لیے صبر کر کے بیٹھ گئی اسے پتا تھا کہ وہ فون کر رہا ہوگا مگر افسوس۔

اس کے سارے کاغذات تیار تھے، چار دن بعد اس کی لندن کی فلائٹ تھی، اس نے یہ خوشخبری ازلان کو سنانے کی غلطی نہیں کی تھی وہ اسے سر پر از دینا چاہتی تھی، جب وہ گھر لوٹی تو ملازمہ تاجو نے اسے بتایا کہ پہلے اس کا سیل فون دیر تک بجتا رہا لیکن کسی نوکر کو بھی پتا نہیں چلا، پھر وائرلیس فون پر اس کے کسی کلاس فیلو کا فون آیا تھا جو کہ دوبارہ فون کرنے کا کہہ کر فون بند کر گیا حرا کچھ جھنجھلا گئی اس نے سیل فون چیک کیا تو ازلان کی اٹھارہ مسڈ کالجز تھیں، مگر مشکل یہ بھی تھی کہ جس کلاس فیلو کا فون آیا وہ وائرلیس پر اینڈ ہوا تھا اور بد قسمتی سے وائرلیس پر سی ایل آئی نہیں تھی، اس لیے حرا کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

کمرے میں آ کر اس نے ازلان کا نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگی فون میسجنگ پر جارہا تھا

I am azlan please leave your message

ریکھت حرا کو بہت کچھ یاد آ گیا جب آخری بار معاذ نے ازلان کا نمبر ملایا تھا تب بھی فون میسجنگ پر تھا اس نے پیغام ریکارڈ کر دیا۔

”ازلان میں حرا ہوں، فرصت سے مجھے فون کر لینا، اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔“ پھر اس نے فون ایک طرف پھینکا اور شاو لینے واش روم میں چلی گئی، فریش ہونے کے بعد اس نے ڈنر کیا اور واپس کمرے میں چلی آئی، اسے ابھی بہت کچھ طے کرنا تھا، ایاز صاحب کی ہدایات اس کے پیش نظر تھیں اور اسے یقیناً اسی حساب سے کوئی لائحہ عمل تشکیل دینا تھا۔

انہوں نے دونوک انداز میں حرا سے بات کی تھی کہ وہ کس حد تک ازلان میں انوالو ہے اور ازلان اس کے ساتھ کس قدر سنجیدہ ہے تو حرا کا جواب تھا۔

”آپ فکر مت کریں انکل! وہ واپسی پر میرے ساتھ ہوگا اور آپ دیکھیں گے کہ وہ ازلان میڈیکل کمپلیکس کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کرے گا“ اس کا لہجہ اس

”وہ جی حرا بی بی تو ایاز صاحب کے ساتھ گئی ہیں“

”اپنے انکل کے ساتھ؟“ اس نے استفسار کیا، حرا نے اسے یہ تو بتایا تھا کہ وہ اپنے انکل کے ساتھ رہتی ہے مگر ازلان نے کبھی مزید تفصیلات جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”اُنہیں جی، انکل تو ان کے سکندر صاحب تھے، ایاز صاحب تو سکندر کے دوست تھے“ دوسری طرف سے تصحیح کی گئی وہ بے طرح چونکا اسے بڑی اچھی طرح یاد تھا کہ احتشام سکندر اور ایاز کی دوستی کی کنون کتنی مضبوط تھی۔

”کون سکندر صاحب؟“ اس نے خدشات کے غلط ہونے کی دعا مانگی۔

”اوجی آپ کو سکندر صاحب کا نہیں پتا، اپنے سکندر صاحب، بیچارے اللہ ایسی موت کسی کو نہ دے، کیا زمانہ آ گیا ہے جی سگا بیٹا بھی جنازے کو کندھا دینے نہیں آیا تھا“ دوسری طرف سے شدید افسوس کا اظہار کیا جا رہا تھا، وہ چند سیکنڈ ہل نہ سکا اسے لگا کسی نے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔

”یہ..... کب..... کی بات ہے؟“ حلق میں جیسے کانٹے سے چہرہ ہے تھے۔

”اب تو ایک سال ہو رہا ہے جی، اگلے مہینے دو فروری کو ان کی پہلی برسی ہے وچاری حرا بی بی کیا صورت ہے اور کیا قسمت ہے؟ پہلے اماں باوا چھوڑ گئے پھر ماموں اور خالاؤں نے اپنانے سے انکار کیا پھر سکندر حیات صاحب نے انہیں اپنی بیٹی بنالیا مگر چھ ماہ بعد ہی ہارٹ اٹیک میں اللہ کے پاس چلے گئے، اب حرا بی بی اکیلی ہوتی ہیں، ویسے آپ کون ہیں؟“ ملازمہ کو غالباً اب اپنے فرض کا خیال آیا تھا۔

میں حرا کا کلاس فیلو تھا، مجھے اس سے کام تھا، پھر فون کر لوں گا“ اس نے سنبھل کر کہا اور کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

آج چونکہ چھٹی کا دن تھا اس لیے حرا نے ایاز کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا، اس کا خیال تھا تھوڑی تفریح بھی ہو جائے گی اور آؤٹنگ بھی اور ضروری معاملات بھی ڈسکس ہو جائیں گے، وہاں جا کر اسے یاد آیا کہ اپنا سیل فون وہ گھر بھول آئی تھی، اسے

دھند اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دل میں گھیرا ڈال رہی تھی دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی اور سیال مادہ اس کے چہرے پر بہنے لگا۔

”آپ چلے گئے پایا، کتنے خود غرض ہیں آپ، مجھے منائے بغیر چلے گئے ابھی تو مجھے آپ کے سینے سے لگنا تھا، ابھی تو مجھے آپ سے لاڈ اٹھوانے تھے اور آپ چلے بھی گئے، بنا مجھ سے ملے اور دو فروری وہ منحوس دن جب میں نے آپ سے بدتمیزی کی، مجھے کیا علم تھا وہ میری بد قسمتی کا شاخسانہ بن جائے گا، وہ دن میری زندگی کا سیاہ ترین دن بن جائے گا، کتنا بد قسمت ہوں میں؟ کیا میری قسمت میں کہیں کوئی خوشی نہیں ہے، کیا مجھے خوش ہونے کا حق نہیں، کیوں؟ کیوں؟“ وہ سر چوکھٹ سے ٹکرا کر سسک رہا تھا ایک طوفان برپا تھا دل میں، اس کا صحیح معنوں میں ایک بار دل چاہا کہ خودکشی کر لے، آنسو قطار در قطار آنکھوں سے بہہ رہے تھے فون بج رہا تھا مگر اسے ہوش کہاں تھا، وہ تو قسمت کی ستم ظریفی پر ماتم کناں تھا، کیسا نصیب تھا اس کا اسے ایک اچھی یاد بھی نہیں مل سکی جو کہ کسی خوشگوار لمحے سے متعلق ہو جو اس نے پایا کے ساتھ گزارا ہو اور یہ بات اسے اور زیادہ رلا رہی تھی یہ آنسو تو شاید اس کے نصیب میں ہمیشہ کے لیے تھے۔

خوشیاں ہمارے پاس کہاں مستقل رہیں
باہر کبھی بنے بھی تو گھر آ کر رو پڑے
کب تک کسی کی یاد میں روئیں گے بیٹھ کر
ہم کتنی بار خود کو یہ سمجھا کر رو پڑے

☆☆☆

”ازلان کہاں تھے کل؟ کتنی بار فون کیا میں نے، ہر بار فون آنسرنگ پر تھا، یہ ڈھیر مینج ریکارڈ کرائے تھے میں نے اور جناب آپ نے ایک کا جواب دینا بھی گوارہ نہیں کیا خیریت؟“ وہ اس کی خاموشی پر چونکی اس لیے نان شاپ بولتی ہوئی ایک دم سے رک گئی۔

”ہوں کچھ ضروری کام تھا“ لہجہ صاف جان چھڑانے والا تھا، وہ حیران سی

قدر پر یقین تھا کہ وہ گنگ رہ گئے۔

”تو تم اس قدر سنجیدہ ہو کہ اپنے ہاسپٹل کا نام بھی اس کے نام پر.....؟“ انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی تھی، وہ پر یقین ہو کر مسکرا دی۔

اور اب اس نے سوچا کہ انکل ایاز نے اس سے کیسے پوچھا کہ وہ کس قدر سنجیدہ ہے، عجیب احتمال سوال ہے نا، وہ تو ازلان کے لیے اس قدر سنجیدہ ہے کہ بیان و زبان سے باہر ہے وہ تو اس کی رگوں میں لہو بن کر بہہ رہا ہے وہ جس کے دکھوں کو حرا نے اپنے دل پر محسوس کیا تھا وہ جس کے لیے حرا کے دل میں جذبوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر رواں تھا، وہ ازلان احمد جو اس کے دل کا بادشاہ تھا کتنا عزیز تھا وہ اسے کوئی اس کے دل سے پوچھتا، وہ گنگناتی ہوئی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

اے عمر رواں آہستہ چل
کچھ خواب ہیں جن کو لکھنا ہے
تعبیر کی صورت دینی ہے
کچھ لوگ ہیں اجڑے دل والے
جنہیں اپنی محبت دینی ہے
کچھ پھول ہیں جن کو چننا ہے
اور ہار کی صورت دینی ہے
کچھ اپنی نیندیں باقی ہیں
جنہیں بانٹنا ہے کچھ لوگوں میں
ان کو بھی تو راحت دینی ہے
اے عمر رواں آہستہ چل
ابھی خاصا قرض چکانا ہے

☆☆☆

وہ گرم صم سا بالکنی میں کھڑا تھا لندن کا پراسرار اور سرد شہر دھند میں لپٹا تھا اور یہ

سڑکوں پر گھوم رہا تھا، نس نس میں بدگمانی اور بے اعتمادی کے شرارے دوڑ رہے تھے۔
 ”پاپا کے گھر رہتے ہوئے تم نے مجھے بتانا گوارہ نہیں کیا کہ تم سکندر حیات
 گردیزی کے ہاں مقیم ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی وفات کی خبر تک مجھ سے
 چھپائی، میں تمہیں دیکھ لوں گا حرا“ اس کی سوچ ہمیشہ سے زیادہ منفی تھی۔

☆☆☆

آج حرا کی فلائٹ تھی، سب سے الوداعی ملاقات کرنے کے بعد اس نے نور
 بی بی کو سب بتا دیا تھا اور ڈھیر ساری تسلیاں دی تھیں کہ وہ ازلان کے ساتھ واپس آئے گی
 تو ان کی آنکھوں میں کتنی ڈھیر ساری نمی چمک گئی تھی اور ایک احساس تشکر بھی تھا۔
 لاہور ایئر پورٹ پر اسے ایاز اور سلمان ایاز سی آف کرنے آئے تھے،
 ڈھیروں دعاؤں کے جلو میں وہ ڈیپارچر لاؤنج میں چلی گئی، اس وقت اس کے اندر ایک
 جوش ایک جذبہ تھا، اس سے روبرو ملنے کا تصور اتنا جاں فزا تھا کہ اس کی رگ رگ میں
 شرارے سے دوڑ رہے تھے، حیرت انگیز طور پر پچھلے دو دن سے ازلان اس کے ساتھ
 بالکل نارمل تھا، معمول کی بات چیت پر ہنسنا ہنسانا سب ٹھیک تھا کیا رد عمل ہوگا اس کا؟ یہ
 سوچ اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی بھر گئی، جہاز نے رن وے کو چھوڑا اور فضا
 میں عقاب کی مانند رفتار بڑھاتا گیا۔

سفر تھا کہ صدیوں پر محیط ہو گیا تھا، اسے لگا پہنچتے شاید صدیاں لگ جائیں،
 جانے کتنا وقت بیتا جب جہاز نے لندن ایئر پورٹ پر لینڈ کیا، کسٹم سے فارغ ہو کر
 جب وہ باہر آئی تو پلے کا رڈ اٹھائے کمپنی کا نمائندہ منتظر تھا وہ اس کی طرف بڑھ گئی۔

”مس حرا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے پوچھا تو حرا نے اثبات میں
 سر ہلاتے ہوئے بمشکل مسکراہٹ چھپائی، اس نے حرا کا تلفظ ”حیرا“ کر دیا تھا۔

”میں مورگن ہوں“ اس نے اپنا تعارف کرا کر اسے اپنے ساتھ آنے کا
 اشارہ کیا۔

مورگن اسے مزید تفصیل بتانے لگا

”ازلان کیا بات ہے؟“ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناں“ وہ کچھ پریشان ہی
 پوچھنے لگی۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں“ جواب مختصر تھا۔

”ازلان“ وہ جھنجھلا گئی۔

”مجھے صاف بتاؤ بات کیا ہے؟ یہ پہیلیاں مت بھجواؤ ورنہ ایک تھپڑ دوں گی“
 وہ دھمکی دے کر بولی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیا۔
 ”اچھا اتنی دور سے تھپڑ کیسے مارو گی، اس کے لیے تو یہاں آنا پڑے گا“ وہ
 نال گیا۔

”تو تم نہیں بتاؤ گے ٹھیک ہے پھر میں فون رکھتی ہوں جب دل چاہے تو شیئر
 کر لینا اللہ حافظ“ وہ ناراض سی فون بند کر گئی، وہ حیران سا چند لمحے فون ہاتھ میں لے کر
 بیٹھا رہا پھر فون بیڈ پر اچھال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

”ہنہ، تم سے شیئر کر لوں حرا، کیا شیئر کروں؟ مجھے تو اب صرف یہ کھوج لگانا
 ہے کہ تم میرے ساتھ یہ گیم کیوں کھیل رہی ہو“ وہ تلخی سے سوچ رہا تھا۔

”کیا چاہیے تمہیں مجھ سے تم جانتی تھیں کہ سکندر حیات کا بیٹا ازلان ہوں، پھر
 بھی تم، مجھے ہمدردیوں کی مار مارتی رہیں کیوں؟ کیا ملے گا تمہیں مجھ سے، اگر پاپا نے تم
 کو اپنی بیٹی بنایا ہے تو یقیناً ان کی پراپرٹی بھی تمہاری ہے پھر.....

پھر..... تمہیں مجھ سے کیا چاہیے؟ یقیناً معاذ کے اور میرے متعلق تم پہلے
 سے جانتی تھیں اس کے باوجود تم یہ ظاہر کرتیں رہیں کہ تم مجھ سے انجان ہو، بابا کے
 ساتھ رہتے ہوئے تم میرے متعلق نہ جان سکو، امپاسیبل، کیسے یقین کر لوں میں کہ تم
 انجان تھیں اور تمہاری یہ نام نہاد دوستی کا ڈرامہ؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ پتا تو میں لگا کر
 رہوں گا اور اس کیلئے میں تمہاری Ending کا انتظار کروں گا حرا احتشام جو کہانی تم نے
 شروع کی ہے اسے ختم بھی تم ہی کرو گی، یہ میرا فیصلہ ہے“ وہ سوچتے ہوئے بے مقصد

”میں آپ کی خدمت پر مامور ہوں آپ کے لیے ہوٹل ٹائنس برج میں بنگ ہے اس کے علاوہ بھی آپ کو جہاں جانا ہو میں حاضر ہوں“ وہ خوش اخلاقی سے کہتا ہوا شاہانہ انداز میں کھڑی رولز رائٹس کی طرف بڑھ گیا اور نہایت ادب سے دروازہ کھولا، اسے ہوٹل میں پہنچانے کے بعد اس نے پوچھا۔

”مس حرامیرے لائق کو خدمت؟“

”آف کورس، مسر مورگن، میرے ایک عزیز یہاں ہیں، یہ ان کے ہاسپٹل کا پتا ہے اور یہ ان کا لینڈ لائن نمبر اور یہ پرسنل نمبر، لیکن بد قسمتی سے میں ان کی رہائش گاہ کے متعلق نہیں جانتی، اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں انہیں سر پرانز دینا چاہتی ہوں ورنہ ان سے خود بھی معلوم کر سکتی ہوں“ وہ ایک کارڈ پر جس پر سب کچھ لکھا ہوا تھا اس کے سامنے رکھ کر بولی۔

”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے شہر کے مرکزی ریکارڈ سے بھی معلوم کیا جاسکتا ہے اور دوسرا سہ یہ ہے کہ ان کے ہاسپٹل سے معلوم کر لیا جائے“ اس نے تجاویز سامنے رکھیں۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں، مجھے تو صرف ایڈریس چاہیے“ وہ مسکرا کر بولی۔

”او کے میم میں آدھ گھنٹے بعد آپ کو ہوٹل کے نمبر پر رنگ کر لوں گا“ وہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

حرا نے ایک طویل سانس لی جس میں خوشی وطمینیت کا احساس نمایاں تھا پھر چیخ کرنے اٹھ گئی، فریش ہونے کے بعد اس نے روم سروس فون کر کے کافی کا آرڈر دیا اور کافی آنے کے بعد پاکستان ڈاکٹر ایاز کو فون ملانے لگی، ان سے بات کر کے اس نے اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی پھر گھر فون کیا، نور بی بی سے بات کرنے کے بعد ابھی اس نے فون رکھا ہی تھا کہ فون پھر سے بج اٹھا، روم سروس سے اطلاع دی گئی کہ کوئی مسٹر مورگن بات کرنا چاہتے ہیں، اس نے کال ملانے کو کہا، کچھ دیر بعد مورگن کی آواز آئی۔

”میم پتا نوٹ کیجئے“

”جی لکھوادیں“ اس نے جلدی سے کہا پھر پتا نوٹ کیا، فون بند کرنے کے

بعد اس نے ”یا ہو“ کا نعرہ لگایا۔

”میں آرہی ہوں ازلاں احمد“ اس نے سفید براق شلوار قمیض جس پر گلابی پھول بہار دکھا رہے تھے زیب تن کیا، پاؤں میں گلابی نازک سے سینڈل پہنے، کانوں میں سونے کی بالیں پہلے سے ہی موجود تھیں، دراز بالوں کو اس نے کھلا چھوڑ دیا، گھٹنوں کو چھوتے دراز بال، جن کی سنہری مائل رنگت سفید لباس پر اور بھی نمایاں تھی تیار ہونے کے بعد اس نے اپنا تنقیدی جائزہ لیا، میک اپ سے اسے پہلے ہی الرجی تھی اس لیے اس نے کبھی چہرے پر تھوپا تھاپی نہیں کی تھی کچھ فطری حسن سے قدرت نے اسے اس قدر فراغ دلی سے نواز تھا کہ کمی ہی نہ تھی، سفید رنگت میں گلابیاں سی گھلی ہوئیں تھی، سنہری آنکھیں ایک دلکش احساس سے جگمگا رہی تھیں، آئینے نے اسے پرفیکٹ قرار دیا، ہوٹل سے باہر آکر اس نے کیب ہائر کی اور ازلاں کے اپارٹمنٹ کا پتا بتایا اور خود سکون سے سیٹ کی بیک سے سر نکا دیا، بیس منٹ بعد اس کے اپارٹمنٹ کی بیل پر ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی، کچھ دیر بیل کی آواز آتی رہی پھر ساتھ والے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور درمیانی عمر کی عورت باہر آگئی۔

”ہیلو کون ہوتم؟“ وہ حرا سے پوچھنے لگی۔

”میں حرا ہوں مجھے ازلاں سے ملنا ہے“ حرا نے شائستگی سے اپنا تعارف کرایا۔

”میں مسز ماریا ہوں، ویسے ازلاں سے کوئی ملنے بہت کم آتا ہے تم اس کی.....؟“ مسز ماریا نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں اس کی دوست ہوں“ وہ شستہ انگلی میں بولی۔

مسز ماریا کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی، یقیناً وہ اپنے بے باک معاشرے کے مطابق دوست کا الٹ مطلب سمجھی تھی۔

”ازلاں تو نو بجے سے پہلے نہیں آئے گا، ابھی تو صرف چھ بجے ہیں لیکن ٹھہرو، ایک چابی میرے پاس ہے، ایک بار ازلاں کی چابی کھو گئی تھی، لاک توڑنا پڑا، پھر اس کے بعد وہ ایک چابی مجھے دے گیا کہ اس طرح کا واقعہ پیش آئے تو ٹینشن نہ ہو۔ وہ

حرا کی آنکھ دھماکے سے کھلی، چند لمحے اسے ماحول کا واقفیت حاصل کرنے میں لگے، پھر وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، سیدھی نظر وال کلاک پر گئی اور دل دھک سے رہ گیا، سوانو، اس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی، زمین پر گری جیکٹ، صوفے پر پڑا بریف کیس کھلا بیڈروم کا آدھ کھلا دروازہ اور ہاتھ روم سے گرتے پانی کی آواز نے اسے یقین دلایا کہ اس گھر کا مکین ہی نہیں اس کے ”دل کا مکین“ آچکا ہے، وہ تیزی سے اٹھی اور بال درست کئے پھر سینڈلیں پہنیں اور دھڑکتے دل کے ساتھ صوفے پر سیدھی ہو کر ٹک گئی، چند منٹ بعد بیڈروم کا دروازہ کھلا اور از لان باہر آ گیا حرا کی نظر بے اختیار اٹھی اور جم گئی، واپس آنے سے انکاری ہو گئی، سیاہ شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں بھیکے بال دراز قامت، گندمی رنگت، سیاہ سحر انگیز آنکھیں اور دائیں گال پر سیاہ چاند، وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی اور حیران تو وہ بھی تھا، اتنا زیادہ کہ قدم آگے نہ بڑھا سکا، اس نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی یا شاید اسے اس سے زیادہ حسین کوئی لگی ہی نہ تھی، دھڑکن رکی تھی یا رواں وہ جان نہیں سکا، سب سے حیرت انگیز چیز لڑکی کی آنکھوں سے پھوٹی شناسائی اور از لان کو ان سنہری آنکھوں میں حیرت نظر نہیں آئی جو عموماً کوئی اجنبی اس کے سیاہ چاند کو دیکھ کر ظاہر کرتا تھا پھر اس نے لڑکی کو سنہلتے دیکھا۔

”السلام وعلیکم!“ از لان کو لگا جھرنے گنگنا اٹھے ہوں۔

”علیکم السلام! تم..... میں..... تمہیں نہیں جانتا“ وہ بھی سنہبل کر گویا ہوا۔

وہ کسی ملکہ کی سی شان سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے نزدیک آگئی، پھر اس کے چہرے پر ایک دل نواز مسکراہٹ آگئی وہ مسمرائیز سا کھڑا رہا۔

”از لان میں حرا ہوں“ وہ دلکشی سے بولی، اسے جھکا اتنا زور دار لگا تھا کو گویا

پورے اپارٹمنٹ کی چھت اس پر آگری ہو۔

”حرا.....؟“ وہ بے یقینی سے بولا۔

”تم حرا ہو؟“

”میں کیسے مان لوں تم حرا ہو؟“ وہ ہنسی۔ ”تو کیا آئی ڈی کارڈ دکھاؤں۔“

کبھی ہوئی مڑیں اور اسے چابی لا کر دے دی، حرا نے سکون سے دروازہ کھولا، اندر داخل ہو کر پھر سے لاک کیا اور بے چینی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، تھوڑی دیر بعد وہ پورے گھر کا جائزہ لے چکی تھی، اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ستائش بھی تھی، یقیناً وہ نہایت صاف ستھری اور منظم زندگی گزارنے کا عادی تھا، حرا کو کہیں بھی گرد کا ایک ذرہ تک نظر نہیں آیا، اپارٹمنٹ کی ہر چیز بیش قیمت اور لا جواب تھی، فرنیچر کے ڈیزائن سے کلیر سلیم تک مکین کے اعلیٰ ذوق کی نشانی تھی، بیڈروم دیکھ کر اسے احساس ہوا وہ کتنی تھک چکی ہے اور ایک لمبی فلائٹ کے بعد اس نے آرام نہیں کیا، اس نے باہر کا دروازہ ان لاک کیا اور لاؤنج میں بڑے صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں، ایک دلفریب خوشبو اس کے چاروں طرف رقص کرنے لگی، ایک خوبصورت اور دلبر با خیال رگ و پے میں طمانیت بھرتا گیا اور چند لمحوں بعد وہ گہری نیند میں ڈوب چکی تھی، وہ تھکا تھکا سا دروازے تک آیا اور جیب سے چابی نکال کر لگائی دو تین بار کی کوشش سے لاک کھل گیا ایک لمحے کو اسے لگا کہ لاک پہلے سے کھلا تھا بلکہ اس نے چابی سے دوبارہ لگا کر کھولا ہے لیکن وہ اتنا الجھا ہوا تھا کہ دھیان دیئے بنا اندر چلا آیا، لاؤنج میں آ کر اس نے بریف کیس پر بے پھینکا اور جیکٹ اتار کر بازو پر ڈالی اور ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتا وہ بیڈروم کی طرف چل پڑا۔ اگلے لمحے اسے عجیب سا احساس ہوا وہ اپنے احساس کو کوئی نام نہ دے سکا، لیکن وہ پھر پلٹا اور دائیں طرف پڑے صوفے کی طرف بڑھا، صوفے کی بیک پر سر رکھے سوئی ہوئی حرا پر نظر پڑی، وہ اس قدر حیران ہوا کہ اس کے ہاتھ سے جیکٹ گر پڑی۔

صوفے کے نزدیک زمین پر پنک چپلیں موجود تھیں، وہ تیزی سے آگے آیا، مگر اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا، اس کے دراز بال اس کے چہرے پر گرے ہوئے تھے، وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ کون ہے؟ یہاں کیسے آئی؟ اسے کیسے جگاؤں؟“ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر کندھے جھٹک کر بیڈروم کی طرف بڑھا، بیڈروم کا دروازہ اس نے اتنی زور سے بند کیا کہ اسے یقین تھا کہ ”محترمہ“ کے فرشتے بھی جاگ جائیں گے۔

ازلان کو اپنے حواس مختل ہوتے محسوس ہوئے۔

”تم حرا ہو تم یہاں کیسے آئیں؟ تم لندن میں کیسے؟ اور تمہیں میرا پارٹمنٹ کا پتا کہاں سے ملا؟“

”کیا یہ سارے سوالات زیادہ اہم ہیں بجائے اس کے کہ تم مجھے اچھے طریقے سے ویلکم کرو؟ وہ بیٹھی ناراضگی سے بولی، وہ چونک کر خود پر قابو پا گیا، پھر بے ساختہ مسکرایا۔“

”بالکل، کیسی ہو حرا؟“ وہ حیرت چھپا کر مسکراتا ہوا پوچھنے لگا، وہ دلکشی سے مسکرا دی۔

”فائن، تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے“

وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گیا، جھک کر جیکٹ اٹھائی، بریف کیس پکڑا اور انہیں مقررہ جگہوں پر پہنچایا، پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا، جو خاموش سی کھڑی تھی۔

”آؤ یکن میں چلتے ہیں اور بتاؤ بھی تمہاری کیا خاطر مدارت کی جائے“ وہ کچن کی طرف چلتا پوچھنے لگا اور اس کے پیچھے چلتی حرا مسکرا دی۔

”کچھ بھی کھلا دو یار، بہت بھوک لگی ہے“ کچھ دیر بعد وہ کچن میں موجود نیبل پر رکھے کافی اور سینڈویچز سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ازلان کے دل پر جو بھی گزر رہی ہوتا ہم وہ اس وقت اپنے تمام احساسات کو نہایت مہارت سے چھپا کر اس کے سامنے اسی گرم جوشی اور وارننگی کا مظاہرہ کر رہا تھا جس کی مقابل کی توقع تھی وہ حرا سے یہ پوچھنے کی غلطی نہیں کر رہا تھا کہ اس نے ازلان کو اپنے فزیکل اسٹرکچر کے بارے میں غلط معلومات کیوں دی تھیں شاید وہ انجوائے منٹ چاہتی ہو ازلان کو حیران کر کے اور اگر اس کا یہ مقصد ہی تھا تو پھر نتیجہ واقعی توقع کے مطابق تھا، ازلان شدت سے حیران تھا۔

اس دوران وہ معمول کی گفتگو کرتے رہے ازلان جیسے ساری باتیں بھول گیا، یاد تھا تو صرف اتنا کہ حرا کی آنکھیں کتنی سنہری ہیں، اس کے بات کرنے کا انداز کتنا خوبصورت ہے اس کی مسکراہٹ کس قدر دلکش اور دلربا ہے خوشی کا یہ احساس اس کے

اندر تک سرایت کر رہا تھا اور اسے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہ تھا کہ اس سے زیادہ خوش وہ آج سے پہلے کبھی نہیں تھا۔

وہ حرا نہیں تھی وہ تو کوئی ساحرہ تھی جو اس کے سامنے بیٹھی سحر پھونک رہی تھی اور وہ کسی سے بس معمول کی مانند اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا اور حرا کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، بے ساختہ کھلکھلا کر ہنستا، کسی بات کے جواب میں بے ساختہ اس کے منہ سے نکلنے والا لفظ ”ناں ناں بات اس طرح نہیں تھی“ حرا کو پاگل بنا رہا تھا کسی بات پر ہنستے جب اس کی آنکھیں بند ہوتی تو وہ دل میں دھڑکتے شور کو سنہلاتی۔

”یا خدا میں کتنی خوش قسمت ہوں“ اس نے بے اختیار سوچا۔

☆☆☆

ازلان نے ہاسپٹل سے تین دن کی چھٹی لے لی تھی، حرا کیونکہ پہلی بار لندن آئی تھی اس لیے وہ سارا لندن گھومنا چاہتی تھی اور اس کے لیے ازلان سے بہتر گائیڈ یقیناً میسر نہیں ہو سکتا تھا۔

اگلے دن وہ ہائیڈ پارک گئے ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ سے لُچ کرنے کے بعد وہ پارک میں گھومتے رہے واپسی پر انہوں نے مختلف ممالک کے سفارتخانے دیکھے جو کہ ہائیڈ پارک کے ساتھ تھے آسٹریا، ڈنمارک، ناروے اور جرمنی کے سفارتخانے بیگ گریو اسکوائر میں ساتھ ساتھ تھے دوسری طرف مشہور ”رابرٹ وکٹر ہال“ تھا جہاں مغنی آرکسٹرا کی پرفارمنس دیکھنے لوگ دنیا بھر سے آتے تھے لیکن اس کے لیے ریزرویشن ہفتوں پہلے کروانی پڑتی تھی اسی علاقے میں ایک ہی جگہ چار میوزیم تھے ان میں ایک نیچرل ہسٹری میوزیم، سائنس میوزیم، جیولری میوزیم، میوزیم موضوعاتی تھے جبکہ وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم ایک عام میوزیم تھا۔

انہیں کے آس پاس تین مشہور کالج، امپیریل کالج، رائل کالج آف میوزیم اور رائل کالج آف سائنس اینڈ آرٹس تھے حرا کو یہ جگہ سب سے زیادہ پسند آئی۔

سارا دن گھومنے کے بعد ڈنر کرنے وہ ایک ہوٹل میں چلے گئے، مینیو کارڈ کا

”گڈ نائٹ“ وہ ہوٹل کی طرف بڑھ گئی وہ اسے تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

حرا نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ لندن اپنے ہاسپٹل کے لیے ایکوپمنٹ کی ڈیل فائل کرنے آئی ہے اور یہ بھی کہ اس نے از لان کے گھر کا پتا کیسے ڈھونڈا۔

سلوڈرائیو کرتے ہوئے بیس منٹ بعد وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھا، دروازہ لاک کرنے کے بعد اس نے لاؤنج کی روشنی جلادی اور خود بیڈ روم میں آگیا، کپڑے چینج کرنے کے بعد وہ بیڈ پر بیٹھا تو اس کی نظر سامنے دیوار پر پڑی اور اسے یاد آیا کہ آسیہ کی تصویر وہاں نہیں تھی، پھر اس نے نچلے دراز سے تصویر نکالی اور اس کی جگہ پر واپس لگادی، کچھ دیر بعد وہ سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔

☆☆☆

از لان کے جانے کے بعد کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر پلٹ کر کمرے میں آگئی بیڈ پر گر کر وہ جانے کوئی عمیق سوچ میں تھی کہ بیتی رات کا پتا ہی نہ چل سکا، رات اپنے ایک تہائی سفر طے کر چکی تھی، مگر وہ بدستور گہری سوچ میں ڈوبی تھی، اگلے دن وہ ”لمبارٹ اینڈ جاسن“ کے آفس گئے تھے، ایکوپمنٹ کی ڈیل صریحاً از لان کی مدد سے طے ہوئی تھی، جوٹیکنیکل اور فنانشل پوائنٹس اس نے اٹھائے تھے وہ تو حرا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے، ٹیبل ٹاک کے پہلے راؤنڈ میں فیصلہ کر لیا گیا، پہلی شب منٹ میں ایکس رے مشین اور اس کے لوازمات یعنی Accessories پورٹیبیل ای سی جی مشین اور پیتھولوجیکل لیبارٹری کا سامان شامل تھا، اس کے بعد سی ٹی اسکینر، ایم آئی آر، سونوگرافی کے علاوہ اینیو گرافی کا سامان روانہ کیا جائے گا اور یہ سب سامان چھ ماہ کے اندر اندر پاکستان میں ان کے انشورنس ایجنٹ کی مدد سے ڈلیور کر دیا جائے گا، کمپنی اس کے بعد مشینوں کی انسٹالیشن اور دو سال تک چیک اپ کی مکمل ذمہ داری لے گی ادائیگی کے طریقہ کار پر بھی اتفاق رائے ہو گیا ان کے اور حرا کے بینکر ادائیگی کے شیڈول میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔

مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے آرڈر دیا اور خود باتوں میں مصروف ہو گئے۔
”آج کا دن میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہے“ حرا نے آسودگی سے مسکرا کر کہا۔

وہ سحر زدہ سا اسے دیکھتا رہا، بلاشبہ جتنا اس کا ظاہر خوبصورت تھا، اتنا ہی باطن بھی تھا اور اس بات کا اندازہ از لان کو اس کے ساتھ دو دن گزار کے ہی ہو گیا۔
”حرا تمہارے خیال میں ظاہری خوبصورتی اہمیت رکھتی ہے؟“ اس نے بے ساختہ دل میں چمکتا ایک خدشہ اس کے سامنے نکال پھینکا۔

”نہیں اگر ایک خوبصورت انسان کے پاس خوبصورت اور حساس دل نہیں ہے جو دوسروں کا درد محسوس کر سکے تو اس کی خوبصورتی ایک فیصد بھی اہمیت نہیں رکھتی، میں خوبصورت دل پہ یقین رکھتی ہوں از لان اور پھر شکلیں تو خدا کی دین ہیں، اگر ہمیں خود کو بنانے کا اختیار دیا جاتا تو ہر شخص خود کو سب سے بڑھ کر خوبصورت بناتا“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی، از لان کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہی مخصوص مقناطیسی چمک جو آسیہ عبدالرحیم کو پاگل کر گئی تھی۔

”میں اپنے سامنے تمہارا رد عمل دیکھنا چاہتا ہوں حرا! اگر میں اپنی خواہش کا اظہار کروں کہ میں“ اس کی بات ادھوری رہ گئی، ویٹریس ڈیش سجانے لگی۔

وہ خاموش ہو گیا، حرا نے کچھ بے چینی سے از لان کو دیکھا، پھر ویٹریس کے جانے کے بعد بول اٹھی۔

”تم کیا کہہ رہے تھے از لان؟“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے، بتاؤں گا“ وہ ٹال گیا اور اسے کھانے کی طرف متوجہ کیا، ڈنر کے بعد از لان نے اسے ہوٹل چھوڑا، گاڑی سے نکلے ہوئے حرا اس کی طرف جھکی۔

”از لان صبح تمہیں میرے ساتھ“ لمبارٹ اینڈ جاسن“ کے آفس جانا ہے“

”ہاں یاد ہے بھئی، گڈ نائٹ“ وہ مسکرا کر بولا۔

واپسی پر اس نے ازلان کا خصوصی شکریہ ادا کیا، تو وہ اسے ڈانٹ کر بولا۔
 ”کہ تمہارے تھینکس کی ضرورت نہیں ہے مجھے“ پھر وہ ریجنٹ پارک گئے
 گھاس پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ازلان نے اس سے کہا تھا۔
 ”میں تمہیں اپنا جانتا ہوں حرا“

وہ گنگ رہ گئی، پلکیں عارضوں پر جھک گئیں اور عارض کھل اٹھے، اتنی بات
 کرنے کے بعد ازلان اٹھ گیا اور واپسی کے سفر میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں
 ہوئی، یہاں تک کہ ایک دوسرے کو گڈنائٹ بھی نہیں کہا تھا اور تب سے اب تک حرا اس
 سوچ میں تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے، سوال ہاں یا ناں کا نہیں بلکہ وہ سوچ کر الجھ رہی تھی
 کہ اسے کن لفظوں میں بتائے کہ اسے حرا کے ساتھ پاکستان جانا پڑے گا جہاں اس کی
 جڑیں ہیں، جو اس کی مٹی ہے اس نے ازلان کی آنکھوں میں آج بے بس کر دینے والی
 چمک دیکھی تھی، ایک طویل سانس لیے کر اس نے سربیک کراؤن سے ٹکرا دیا اور آنکھیں
 موند لیں۔ تیری آنکھوں نے میرے گرد اک دیوار کھینچی ہے میں اس سے بھاگ کر جانا
 بھی چاہوں تو کہیں بھی اب جا نہیں سکتی۔

کہ پیروں سے کوئی زنجیر اب بے آواز لپٹی ہے یہ وہ دیوار ہے جس میں کوئی
 روزن نہیں کھلتا میں اس میں در بناتی ہوں تو اک دشت میرا راستہ روکے۔

میرے کانوں میں اک پر کیف سی آواز آتی ہے

یہاں سے بھاگ کر جانا کوئی آسان نہیں

محبت اس قدر کمزور میری جان نہیں ہے

تیری آنکھوں نے میرے گرد جو دیوار کھینچی ہے

میں اس کو توڑنا چاہوں تو تسبیح سر کو آتا ہے

یہاں اڑنا کہاں اس طائر بے پہر کو آتا ہے

میری ساری توانائیاں یہاں ناکام ہوتی ہیں

یہیں اب صبح ہوتی ہے، یہیں اب شام ہوتی ہے۔

اگلے دن اس نے ڈاکٹر ایاز کو فون کیا تھا۔ انہیں ساری تفصیل بتانے کے بعد
 وہ ان کی بات سنتی رہی، قریباً آدھا گھنٹہ مزید ڈسکشن ہوتی رہی پھر حرا نے فون بند کر دیا۔
 اس دن وہ سارا دن کمرے سے نہیں نکلی وہ فریٹن ذہن کے ساتھ آگے کا
 لائحہ عمل طے کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے کاؤنٹر پر فون کیا۔

”نوفون نو وزیر پلیر“

”یس میم“ اس نے تھینکس کہہ کر فون رکھ دیا۔

سارا دن کسٹمندی سے پڑے پڑے اس نے چار کپ کافی کے پیئے بنا کچھ
 کھائے پیئے کافی پینے سے آنتیں سلگ اٹھیں، سات بجے کے قریب وہ فریش ہونے
 کے لیے اٹھی، نہا کر لباس بدلا، سیاہ زمین پر زرد پھولوں سے بھرا شلوار سوٹ اس کے
 وجود پر ج کراپنی قیمت بڑھا گیا، پاؤں میں سیاہ چپل پہن کر اس نے بالوں کو کھلا چھوڑا
 اور کاؤنٹر پر رابطہ کیا۔

”کوئی میسج؟“ حرا نے پوچھا۔

”جی میم۔ کوئی مسٹر ازلان دوبار خود آئے ہیں اور ستائیس کالز کر چکے ہیں،
 لیکن چونکہ آپ کی اجازت نہیں تھی اس لیے ہم نے ان کو کالز کو ڈراپ کر دیا“ شائستگی
 سے کہا گیا۔

”اٹس اوکے“ اس نے فون رکھا اور ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر کی طرف چل پڑی،
 روڈ پر آ کر اس نے کیب ہار کی اور ازلان کے اپارٹمنٹ کا پتا بتایا، تھوڑی دیر بعد وہ اس
 کے اپارٹمنٹ کی بیل بج رہی تھی، کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا، دروازے کے فریم میں
 ازلان کی شکل نظر آئی نیوی بیلو شرٹ اور بیلو جینز میں ملبوس، سیاہ بال اس کی پیشانی پر
 گرے تھے اور اس کی آنکھیں سوچی ہوئی متورم تھیں، وہ بے طرح چونکی، وہ اسے دیکھ
 کر آگے سے ہٹ گیا اس نے اندر داخل ہو کر خود ہی دروازہ بند کیا اور ازلان کے پیچھے
 چلتی ہوئی اس کے بیڈ روم تک آ گئی۔

پورا کمرہ بکھرا پڑا تھا، بیڈ پر سوٹ کیس کھلے تھے اور وارڈ روب پوری کی پوری

”ازلان کیا بات ہے؟ تم کہیں جا رہے ہو؟“

”ہوں“ وہ پھر سے کپڑے وارڈ روب سے نکال کر باہر پھینکنے لگا۔

”کہاں؟“ وہ چوکی

”میں نے اپنی پوسٹنگ لیڈز (Leads) کروالی ہے“ حرا پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

”لیکن کیوں؟“ وہ خطرناک تیوروں سے اس کی طرف مڑا۔

”اس لیے حرا احتشام کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ زبانی باتیں کرنے میں اور عملاً کر کے دکھانے میں بڑا فرق ہے اور تم یہاں کیوں آئی ہو؟ میرا تماشہ دیکھئے“ وہ پھنکارا اٹھا۔

”ازلان تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ ششدر رہ گئی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے حرا احتشام میں کچھ نہیں جانتا، میں سب جانتا ہوں، تم

نے مجھ سے پاپا کی ڈیٹھ کی خبر چھپائی، تم نے مجھے بتایا کہ تم کسی انکل کے ساتھ رہتی ہو،

تم نے یہ ظاہر کیا کہ تم مجھ سے انجان ہو، تم کیا چاہتی ہو مجھ سے؟ میں جان چکا ہوں کہ

پاپا نے تمہیں اپنی بیٹی بنایا تھا، لازمی بات ہے وہ اپنی ساری پراپرٹی تمہارے نام کر چکے

ہیں کیونکہ نہ تو میں ان کا بیٹا تھا اور نہ ان کا وارث، پھر تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا کیوں؟

دولت چاہیے تھی کیا؟ دل نہیں ابھی تک بھرا ہوگا، ہوتے ہیں کچھ لوگ ہوس پرست، جن

کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی“ زہریلا لہجہ اس قدر تلخ الفاظ کہ حرا کی نس نس زہریلی ہو گئی

وہ گم صم بیٹھی خود پر لگائے گئے الزامات کی تفصیل سن رہی تھی، رنگ زرد پڑ چکا تھا وہ لا کر

میں سے سب کچھ نکال کر پلٹا۔

”یہ او“ اس نے اے ٹی ایم کارڈ، ڈیٹ کارڈ، کریڈٹ کارڈ، چیک بکس،

اکاؤنٹس کی تفصیلات کی فائل سب کچھ اس کی گود میں پھینک دیا۔

”سب لے لو اور میری جان چھوڑ دو، چلی جاؤ یہاں سے جاؤ“ وہ بلند آواز

میں دھاڑا۔

”چلی جاؤ، ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا“ وہ رخ موڑ کر چلایا، درد اور اذیت میں

ڈوبی آواز ابھری اور حرا کو یکنخت ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں سب پہلے سے جانتی تھی“ حرا کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ وہ بمشکل سن سکا۔

”اس دن معاذ بھائی کی انگیجمنٹ تھی جب واپسی پر انہوں نے تمہیں

فون کیا، نمبر میں نے ملایا تھا، تمہارا فون آنسرنگ پر تھا، اسی دوران ایکسیڈنٹ ہو گیا،

سکندر انکل مجھے اپنے گھر لے آئے، ان کی وفات کسی شدید شاک کا نتیجہ تھی، کیونکہ وہ

پہلے ہی ہارٹ پیشمنٹ تھے، اس لیے ان کی ڈیٹھ کے بعد گھر میں تمہارا ذکر ہونے لگا

میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی، لیکن سکندر انکل کی وصیت کے مطابق یہ

جائیداد ہم دونوں کو اسی صورت ملتی جب ہم شادی کرتے، تب مجھے تمہارے بارے میں

جاننے کا تجسس پیدا ہوا، پھر راستے بنتے گئے، مختلف ذرائع سے ملنے والی معلومات اتنی

ہی تھیں کہ سکندر انکل کا تم سے ناروا سلوک ان کی کسی شدید نفسیاتی کمزوری کی نشانی تھا،

ڈاکٹر ایاز نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتایا تھا، وہ دن میری محبت کا

پہلا دن تھا ازلان، میں نے اسی وقت تم سے محبت کرنی شروع کر دی تھی جب تمہاری

درد اور اذیت بھری زندگی کے متعلق جانا تھا اور یہ محبت بڑھتی گئی، میرے دل میں یہ

احساس کنڈلی مار کر بیٹھ گیا کہ مجھے تمہیں اپنا بنانا ہے، تمہیں واپس لانا ہے، پھر ڈاکٹر ایاز

نے مجھے تمہارا نمبر، نیٹ آئی ڈی اور ہسپتال کا پتہ دیا، اس طرح میں نے تم سے دوستی کی،

تمہیں احساس دلایا کہ تم میرے لیے کتنے خاص ہو“ حرا کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو

سچے موتیوں کی مانند گر رہے تھے۔

”اور تم اپنے دل میں اتنے ڈھیر سارے شکوے دھرے بیٹھے ہو، تم ایک بار

بات تو کرتے میں خود تمہیں سب کچھ بتا دیتی، میرا لندن آنا بھی باقاعدہ پلاننگ تھی،

ایکو پمنٹ کی ڈیل فائل کرنے تو کوئی بھی آسکتا تھا مگر میں خود اس لیے آئی کیوں کہ

مجھے تمہیں اپنا بنانا تھا، صرف سر پرانز کی وجہ سے میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا اور کل سارا

دن ہوٹل کے کمرے میں بند ہو کر میں نے یہی سوچا کہ یہ سب میں تمہیں کیسے بتاؤں؟

جہاں سے حرا نے اپنا سامان سمیٹا اور باقاعدہ چیک آؤٹ کرنے کے بعد وہ اور ازلان کراپارٹمنٹ آگئے۔

ازلان اندر داخل ہونے کے بعد سکون سے لاؤنج کے صوفے پر دراز ہو گیا، ہ کچھ حیران کچھ پریشان سی بیڈروم میں چلی آئی، بیڈروم کی حالت دیکھ کر اس کا سر جکرا گیا، ہر طرف پھیلاوا تھا۔ سمیٹے سمیٹے بھی اسے ایک گھنٹہ لگ گیا، سب کچھ سمیٹ کر وہ تھک کر بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ کھلے دروازے سے ازلان ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔

”ہماری تھکی ہوئی مزر کے لیے چائے حاضر ہے“ وہ کلکھلاتا اسے زہر لگا۔

”خود تو بڑے سکون سے صوفے پر دراز تھے اس وقت احساس نہیں ہوا تھا کہ نئی نویلی مزر سے کام کروانا زیادتی ہے“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

”دیکھو حرا جس ذہنی پریشانی کے عالم میں میں نے کمرے میں یہ غدر بچایا تھا میں دوبارہ اس کمرے میں آنا نہیں چاہتا تھا ورنہ وہ سب دوبارہ دیکھ کر خواہ مخواہ ذہن پر اگندہ ہو جاتا اوکے“ وہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں وضاحت دے کر اس کے ہاتھ میں چائے کا گک تھمانے لگا، وہ بھی نارمل ہو کر چائے کی چسکیاں لینے لگی، چائے کا گک خالی کرنے کے بعد وہ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہی تھی، جب ازلان نے پکارا۔

”حرا“ ازلان نے اسے جذبوں کی پوری شدت سے پکارا، وہ ساری جان سے لرز گئی۔

”میں تمہارے سامنے کوئی ڈھیر سارے وعدے اور قسمیں نہیں کھاؤں گا، لیکن میں تمہاری توقعات پر پورا اترنے کی کوشش ضرور کروں گا اور تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا“ اس نے حرا کا ہاتھ تھام کر اس کی پشت پر بوسہ دیا۔

حرا نے نگاہیں اٹھائیں، تھوڑی دیر پہلے کی شدت سے کئی گئی گریہ زاری کے باعث آنکھوں کے زیریں کنارے سرخ تھے، ازلان دیوانہ سا ہو گیا وہ اس کے کندھے سے سر نکا گئی۔

”تم میرے لیے سب سے زیادہ خاص ہو ازلان احمد، تم کیا جانو جنہیں دل

میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی ازلان، صرف اس لیے تم سے یہ سب چھپایا اور تم کو لگا کہ میں بھاگ رہی ہوں، میں تمہیں قبول نہیں کر سکتی اس لیے“ وہ سسک اٹھی۔

”تمہیں پتا ہے یہ ایکو پمنٹ کس لیے ازلان، یہ سارا کچھ ازلان میڈیکل کمپلیکس کے لیے ہے جو میرا ہسپتال ہے اور میں نے اسے تمہارے لیے بنایا ہے ابھی تک اس کا آغاز نہیں ہوا کیونکہ اس کا افتتاح تمہیں اپنے ہاتھوں سے کرنا ہے“ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

وہ گویا فریز ہو چکا تھا اس کے آنسوؤں نے یکنخت اسے ہوش کی دنیا میں لا پٹھا۔

”حرا“ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا، جی چاہا اسے بانہوں میں لے کر اس کے سارے اشک اپنی پوروں میں جن لے مگر اسے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا، یاد آیا کہ رشتہ نامحرم تھا

”حرا خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ“ وہ سراپا التجا بن گیا۔

”مجھے معاف کر دو ازلان میں نے تمہارا دل دکھایا“ وہ کہتی ہوئی اٹھی تو گود میں پڑا سب کچھ زمین پر ڈھیر ہو گیا، وہ جانے کے لیے مڑی، وہ اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

”ایسے نہیں جاسکتی ہو تم، مجھے نہ بتانے کی سزا ملے گی“ اس کا لہجہ شریر ہو گیا، وہ سر جھکائے آنسو پیتی ہونٹ پکیتی رہی۔

”ہر سزا منظور ہے مجھے“ وہ آنسو پھر لڑک گئے۔

”تمہیں ابھی اور اسی وقت مجھ سے نکاح کرنا ہوگا“ ازلان نے دھماکہ کیا۔

”کیا؟“ وہ سراٹھا کر حیرت سے چلائی۔

☆☆☆

نکاح ایک قریبی مسجد میں ہوا تھا، نکاح سے پہلے ازلان نے ڈاکٹر ایاز کو فون کر کے باقاعدہ اجازت لی تھی، کہ بہر حال وہ حرا کے سر پرست کی حیثیت رکھتے تھے، نکاح مسجد میں موجود چند لوگوں کی موجودگی میں ہوا تھا، ازلان اس مسجد میں اکثر جمعہ کی نماز کے لیے گواہوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا، نکاح کے بعد وہ بوٹل گئے

اوپر گری تھی“ جوزف نے بتایا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو جوزف، لیکن مجھ سے زیادہ اس کی حفاظت تم کر سکتے ہو یہ تم رکھ لو“ ازلان نے طویل سانس لے کر خود کو ان پچھتاؤں کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی کوشش کی جو اس کے پیروں سے لپٹ رہی تھیں۔

”میں ہمیشہ کے لیے پاکستان جا رہا ہوں، شاید کبھی واپس نہ آؤں“ وہ کہہ کر اٹھا اور باہر نکل آیا، ذہن سے ساری سوچیں جھٹک کر۔

☆☆☆

جہاز نے لاہور ایئر پورٹ پر لینڈ کیا، کسٹم اور امیگریشن کے معاملات سے فارغ ہو کر وہ باہر آئے تو ڈاکٹر ایاز اور سلمان ایاز موجود تھے۔

ازلان ان کے سینے سے لگا تو بے اختیار آنکھیں نم ہو گئیں، کچھ دیر بعد ان کی گاڑی گردیزی ہاؤس کی طرف رواں دواں تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر سلمان تھا اور پیئرز سیٹ پر ڈاکٹر ایاز جبکہ حرا اور ازلان پچھلی نشست پر براجمان تھے۔

”میں جانتا ہوں ازلان بیٹا کہ تمہیں شکوہ تو ہوگا کہ تمہیں سکندر کی ڈیجھ کے متعلق نہیں بتایا گیا لیکن اس کی بڑی سالڈرین ہے ایک تو تم نمبر چینج کر چکے تھے دوسرا جب میں نے تمہارے بارے میں نیٹ سے انفارمیشن لی تو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں پھر نہ ہم تمہارا سراغ کھو بیٹھیں بس اس لیے ورنہ اور کوئی وجہ نہ تھی“ انہوں نے اپنی طرف سے اس کا دل صاف کیا۔

”جی انکل“ وہ سرد آہ بھر کے سر جھکا گیا۔

”ویسے حرا جو کام تم نے کر دکھایا ہے نا اس کے لیے تم انعام کی حقدار ہو“ وہ موضوع بدل کر بولے، حرا کھلکھلا اٹھی۔

”میرا انعام مجھے مل چکا ہے انکل“ اس نے ازلان پر قربان ہونے والی نگاہ ڈالی۔

کار میں ایک تہقبہ گونج اٹھا، جلد ہی وہ گردیزی ہاؤس پہنچ گئے۔

نور بی بی ان کی آمد کے بارے میں بے خبر تھی، ازلان کو دیکھ کر ایک لمحے کو

کی بادشاہی سوئپ دی جاتی ہے وہ کتنے خاص ہوتے ہیں میرے دل میں جھانک کر دیکھو“ حرا کی جھمی سرگوشی اس کی روح میں تراوٹ بھر گئی، ایک خوشبو چاروں طرف رقص کرنے لگی، فضا میں نشہ سا گھل گیا وہ جھک کر اس کی آنکھیں چوم رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے تین دن میں انہوں نے سارا لندن گھوما تھا، ازلان نے اسے ہر قابل دید جگہ دکھائی تھی، ازلان ریزائن کر چکا تھا، سب کے لیے ڈھیروں شاپنگ کی گئی وہ اور حرا سارا دن گھومتے رہتے اور جب شاپنگ کرتے تھکتے تو گھر آ جاتے، اس دوران ازلان اپنے اثاثوں کو پاکستان منتقل کر چکا تھا سب سے الوداعی ملاقاتیں بھی کر چکا تھا، ان کے پاکستان جانے سے ایک دل پہلے وہ ”اولڈ پبلک لائبریری“ گیا تھا۔

جوزف حسب معمول کاؤنٹر پر موجود تھا وہ اسے اپنے آفس لے گیا، جب دونوں نشستوں پر بیٹھے تو جوزف اٹھ کر ایک طرف بنی کپ بورڈ میں کچھ تلاش کرنے لگا کچھ لمحوں بعد اس نے ہاتھ میں پکڑا ایک ڈبہ ازلان کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ ازلان نے حیرانگی سے پوچھا، جوزف استہزائیہ انداز میں مسکرا دیا۔

”جن لوگوں سے ہمیشہ پیار نہ ہوا نہیں اپنی زندگی میں کبھی شامل نہیں کرنا چاہیے ازلان وہ تمہارے لیے اتنی غیر اہم تھی کہ تم اس کی ایک یاد بھی نہ سنبھال سکے“ اس کی آنکھوں میں کرب تھا۔

ازلان نے کچھ تجسس کے عالم میں ڈبہ کھولا اور اسے دھچکا لگا یہ اس کی اور آسیہ کی تصویر تھی ”رابرٹ کنز ہال“ کے سامنے بنوائی گئی جو کہ ازلان نے اس دن بے حد غصے کے عالم میں کھڑکی سے باہر پھینک دی تھی جب حرا کے بارے میں شدید غلط فہمی میں مبتلا تھا۔

”یہ تمہیں کہاں سے ملی؟“ ازلان کے چہرے پہ حیرت درج تھی۔

”تمہارے اپارٹمنٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے پکھرے کے ڈبے کے

سے خود کو آزاد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، تیرہ سال بعد اس نے پاکستان قدم رکھا تھا۔
 ”اس واپسی کا مقصد؟ اس واپسی کا محرک.....؟“ اس نے ڈبڈبائی ہوئی نظر سے اپنے ساتھ کھڑی حرا کو دیکھا دل میں اس کے لیے موجود محبت کچھ اور بڑھی تھی، جنوں خیزی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا، عشق کچھ اور شدت سے بڑھ گیا تھا، افتتاحی تقریب عروج پر تھی، ازلان کو اسٹیج پر اپنے تاثرات بیان کرنے کی دعوت دی گئی۔
 سیاہ ڈزسوٹ میں آنکھوں میں ڈھیروں چمک لیے جب وہ روسٹرم پر آیا تو اس کی نظریں بھرے پنڈال سے ہوتی ہوئیں فرنٹ پر بیٹھی حرا پر جم گئیں، سرخ لباس میں وہ اس کے دل میں پوری شان سے براجمان تھی۔
 ”حرا کے لیے جو میری بیوی ہے، میری زندگی ہے اور اس سب کی وجہ بھی ہے“ اس کے لب دھیرے دھیرے گنگٹانے لگے۔

عجب اک چاند ہے
 میری بے نور راتوں کے دامن میں
 عجب اک چاند ہے
 کہ جس کے لمس میجانے
 جن لیے ہیں درد سارے
 کہ چاندنی نے جس کی
 میرے بدن میں گڑی سویوں کو
 درد کی زنگ آلود سویوں کو
 نکال پھینکا ہے

میری بے نور راتوں کے دامن میں
 عجب ایک چاند چمکا ہے
 کہ قربتوں میں جس کی
 پایا ہے نکھار جاں نے

انہیں سکتہ سا ہو گیا، پھر اسے خود سے لپٹا کر جو وہ روئیں تو ہر آنکھ نم ہو گئی، حرا نے نم آنکھوں سے سوچا۔
 ”بھولا مسافر لوٹ آیا ہے۔“

☆☆☆

وہ اس وقت سکندر حیات گردیزی کی قبر پر موجود تھا، آنسو ایک تواتر سے اس کا چہرہ بھگور رہے تھے۔
 ”میں نے آپ کو معاف کیا پاپا، میری دعا ہے میرا اللہ بھی آپ کو معاف کر دے، میں کیا کرتا پاپا، میں آج جو یہاں ہوں تو صرف اس لڑکی کی وجہ سے جو سینے میں سونے کا دل رکھتی ہے اور یہ میرے رب کا خاص کرم ہے کہ وہ ”میری“ ہے“
 جدائی

بے بسی..... تنہائی

آنسو

کسی کی آس

خواہش

عشق لا حاصل یہ سب کیا ہے؟

جنوں کے راتے اور

بے نشان منزل

اور سکندر حیات گردیزی نے بھی تو جنوں کے راستوں پر چلتے ہوئے ایک بے نشان منزل کی مانند زندگی گزار دی تھی، وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے قبرستان سے نکل گیا۔

☆☆☆

اللہ! میڈیکل کمپلیکس کی وسیع و عریض شاندار عمارت اس کی نظروں کے سامنے تھی، سیرہ سال کے طویل عرصے کے بعد وہ اپنے پیروں سے لپٹی زنجیروں

جمال صد ہائے بہاراں کا
 کہ آنکھ جس کی
 ہجوم اک روشنیوں کا
 میری راہ گزر پہ چھڑکا ہے
 میری بے نور راتوں کے دامن میں
 عجب اک چاند چمکا ہے
 کہ احساس چاہ نے جس کے
 مجھے جینا سکھایا ہے
 اس کی آرزو کا دل آویز لمحہ
 میری ہتھیلی پہ اٹکا ہے
 کہ نگاہ ناز نے جس کی
 مجھے ہنسنا سکھایا ہے
 عجب اک چاند چمکا ہے
 میری بے نور راتوں کے دامن میں
 عجب ایک چاند چمکا ہے

